اردو ناولوں میں
عورت کی سماجی حیثیت

صغرا مہدی

ناشر:
سجاد پبلشنگ ہاؤس
106 حوض رانی - مالویہ نگر - نئی دہلی 110017

اردو ناولوں میں
عورت کی سماجی حیثیت

صغرا مہدی

ناشر:
سجاد پبلشنگ ہاؤس
106 حوض رانی ۔ مالویہ نگر ۔ نئی دہلی 110017

نام کتاب : اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت

مصنفہ : صغرا مہدی

سن اشاعت : 2002ء

تعداد اشاعت : 500

قیمت : -/80 روپے

مطبع : ثمر آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۶

کمپوزنگ : محمد ذکیرالدین ذکی S1-11 جوگا بائی، نئی دہلی ۲۵۔ فون: 6327449

ناشر : سجاد پبلشنگ ہاؤس 106 حوض رانی، مالویہ نگر نئی دہلی۔17 فون: 6683376

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

تقسیم کار:

1- مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی 25

2۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، نئی دہلی 2

3۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، نئی دہلی 2

انتساب

اپنے بھائیوں
اقبال مہدی
ظفر مہدی (مرحوم)
اور
رضا مہدی
کے نام
جو عورتوں
اور
مردوں کی
مساوات کے حامی ہیں

فہرست

پیش لفظ

ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے اور اس میں معاشرے میں ہونے والے واقعات، حالات اور طرز فکر، رسم ورواج کی تصویر بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے جب اردو ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ابتداء ہی سے اس میں ہندوستان کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں مگر عورتوں کی سماجی حیثیت ان کا خاص موضوع ہے۔

عورتوں کی آزادی کا مطلب ہر زمانے میں اپنے اپنے ملک کے حالات اور تہذیبی پس منظر کے لحاظ سے الگ الگ لیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً مغرب کی جدید ترین تحریک نسواں Womens's Lib اس نقطہ نظر پر مبنی ہے کہ مردوں نے عورتوں کو اپنی طاقت کے زور پر اپنا تابع رکھا ہے اور اس کو صنف نازک کہہ کر اب تک وہ بے وقوف بناتا آیا ہے۔ اس کو اپنی طاقت اور صلاحیتوں سے بے خبر رکھا ہے۔ اس نے عورت کے یہ ذہن نشین کر دیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ مردوں کا دل بہلائے، بیوی بن کر بچے پیدا کرے، گھر داری کرے، گھر کو مرد کے لیے جنت کا نمونہ بنائے۔ دوسری طرف یہ جب چاہے تو طوائف کے طور پر کوٹھوں کی زینت بنے اور ان کے لیے ذوقِ نظر اور تسکین دونوں کا سامان مہیا کرے۔ عورتوں کے لیے مردوں نے جو ضابطہ اخلاق بنایا ہے وہ بالکل قابل عمل نہیں ہے۔ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے برابر حصہ ملنا چاہیے۔ عورتوں کو خود اپنی مرضی اور خوشی سے زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہیے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ انھیں اس کا حق بھی ملنا چاہیے کہ مردوں کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کریں جس قسم کا سلوک وہ عورتوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ عورتوں کی جسمانی اور فطری ساخت طبیعت اور مزاج مرد سے الگ ہے۔ یاد رہے کہ الگ ہے، کم تر نہیں۔ اس لیے مردوں کے سانچے میں نہ وہ ڈھل سکتی

ہے نہ اسے ڈھلنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اس کی اپنی انفرادیت باقی رہنا ضروری ہے۔ اس کی اپنی ذات کے لیے بھی اور سماج کے لیے بھی۔

مغرب میں عورتوں کی آزادی کا جو تصور ہے اس میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہم ہر وہ کام کریں جو مرد کریں، ان جیسا لباس پہنیں ان کے قدم بہ قدم چلیں اور اس طرح غیر شعوری طور پر ان کی برتری تسلیم کر لیں۔ عورت کو اپنے عورت ہونے پر فخر کرنا چاہیے اور اپنی صنفی خصوصیت کے ساتھ اسے آزادی ملنی چاہیے کہ وہ اپنی پسند کی زندگی گزارے اور اس کا عورت ہونا اس کی ترقی میں حائل نہ ہو۔

ہندوستان میں انیسویں کا آخر اور بیسویں صدی عورتوں کی آزادی کی جدہ جہد کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ یہی زمانہ اردو میں ناول کی ابتداء کا ہے اور اردو ناول کی ابتداء ہی عورتوں کی تعلیم اور خاندانی سطح پر ان کی اہمیت کو منوانے کے لیے ہوئی۔ اس طرح تحریک نسواں میں ایک طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے عملی طور پر اسکول و کالج قائم کر کے کانفرنسیں بلا کر عورتوں کے رسالے نکال کر، عورتوں کی تنظیمیں قائم کر کے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ دوسری طرف اردو ناول نگاروں کی بہت بڑی تعداد نے اپنی ناولوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم، ان کے حقوق اور اس زمانے کے لحاظ سے ان کی آزادی کی حمایت کی۔ بہت سے ناول نگاروں نے ایسے ناول بھی لکھے جو عورتوں کی اس آزادی کے خلاف تھے جو انگریزوں کی تقلید میں حاصل کر رہی تھیں جو انھیں اپنی گھریلو ذمہ داری سے دور کر کے کلبوں کی زینت بنا رہی تھیں۔

ہندوستان میں آزادئ نسواں کی حمایت اور عورتوں کے سماجی رتبے کو بڑھانے میں اردو ناولوں کا بہت بڑا رول ہے۔

ہم نے ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک کی جو اردو ناولیں لکھی گئیں ان کا مطالعہ کیا اور اس کے لیے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، الہ آباد اور لکھنؤ کی لائبریریوں، حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری، سالار جنگ میوزیم کی لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری، کلکتہ کی نیشنل لائبریری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ اور نینی تال کی پبلک لائبریری سے متعلق مواد فراہم کیا۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی لائبریریاں بھی دیکھنے کا موقع ملا۔

ہم نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں مختصراً ہندوستان میں جدید دور کی ابتداء پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے میں مختلف مذاہب میں عورت کا کیا مقام دیا ہے اس کا جائزہ لیا گیا اور تیسرے میں انیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی حیثیت کیا تھی اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ اس باب کے شروع میں اقوامِ عالم نے عورت کو کیا مقام دیا ہے اس کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان ہے 'ہندوستان میں تحریکِ نسواں'۔ اس سلسلے میں عام طور پر پھیلی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم و تربیت کے حامی تھے اور ان کی تحریک نے عورتوں میں بیداری پیدا کی۔ انھوں نے اپنے زمانے میں 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ تحریک نسواں کے حامی اور اس میدان میں انتھک محنت کرنے والوں کی کوششوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پانچواں باب اصل موضوع سے متعلق ہے اور بہت طویل ہے۔ یعنی اردو ناولوں میں ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک عورتوں کی سماجی حیثیت۔ تھوڑی سی تمہید کے بعد اس باب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تعلیم

۲۔ پردہ

۳۔ بیوہ کے مسائل

۴۔ طوائف

۵۔ تعدادِ ازدواج، بے جوڑ شادی، طلاق اور خلع وغیرہ۔ آخر میں خلاصہ بحث ہے۔

اس کام کو کرنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے جو گرانٹ منظور کی میں اس کی بہت مشکور ہوں۔ جامعہ کے ان اراکین کی ممنون ہوں جنھوں نے یو جی سی اور میرے درمیان تال میل پیدا کیا۔ میں پروفیسر صدیق الرحمٰن کی مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کام کو کرنے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن میں میری پیروی کر کے مجھے گرانٹ دلوائی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو سے اس کی طباعت کے لیے مالی تعاون بھی دلوایا۔

پروفیسر شمیم حنفی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے اس پروجیکٹ کا پروپوزل بنانے میں میری مدد کی، جناب محمد شجاعت کی مشکور ہوں کہ انھوں نے حسابات کے مشکل مراحل طے کرنے میں میری مدد کی۔

اس پروجیکٹ کو پورا کرنے میں ڈاکٹر نیر جہاں نے میری جس طرح مدد کی ہے اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں شکریہ ادا کروں۔ مگر ان کی قابلیت، مستعدی، سمجھ بوجھ اور خاموشی سے کام کرنے کی عادت سے میں بہت متأثر ہوں۔

صغرا مہدی

6 دسمبر 2001ء

عابد ولا، جامعہ نگر نئی دہلی

پہلا باب

ہندوستان میں جدید دور کی ابتداء

پہلا باب

ہندوستان میں جدید دور کی ابتداء

ہندوستان میں ماڈرن ایج کی ابتداء اس وقت ہوئی جب یہاں مغلیہ حکومت کمزور ہو چکی تھی اور انگریز قوم جو تجارت کی غرض سے جہانگیر کے وقت میں ہندوستان آئی تھی اس نے یہاں کی سیاسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں کی سیاست میں دخیل ہونا شروع کر دیا تھا اور جیسے جیسے مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی گئی انگریزوں کا سیاسی تسلط بڑھتا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ان کا رویہ ہندوستانیوں سے دوستانہ تھا اس کے بعد جب انھوں نے پوری طرح ہندوستان پر قبضہ جما لیا تو خود کو حاکم اور ہندوستانیوں کو غلام سمجھ کر ان پر حکومت کرنے لگے۔ ان میں حاکمانہ شان پیدا ہو گئی۔ ان میں نسلی اور تہذیبی غرور پیدا ہو گیا اور وہ اس کا شدت سے مظاہرہ کرنے لگے۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک تھا۔ یہاں مختلف مذاہب اور اقوام آباد تھیں۔ ان کی زبانیں، رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ہندوستان کے بعض حصے کے لوگ ہندوستان کے ہوتے ہوئے بھی خود کو ہندوستانی نہیں کہتے تھے، مثلاً دکن کے شمالی ہندوستان کو ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کو ہندوستان کہتے تھے۔ جب ہی تو فانیؔ بدایونی نے حیدر آباد امیں یہ شعر کہا تھا۔

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اس صورت حال کا انگریزوں نے جو عرف عام میں فرنگی کہلاتے تھے، خوب فائدہ اٹھایا۔ کچھ جیالے ہندوستانیوں نے گو کہ ان کی تعداد بہت کم تھی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ٹکر لی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر اس سے انگریزوں پر یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ

ہندوستانی بہت آسانی سے ان کی غلامی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں اس لیے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جسے انھوں نے بغاوت کا نام دیا تھا، انھوں نے ایک طرف باغیوں پر اپنے جبر و ظلم کا شکنجہ کسنا شروع کر دیا، دوسری طرف ایسی تدبیریں سوچتے کہ وہ اپنی حکومت کو تا دیر ہندوستان میں قائم کر سکیں۔ دوسری طرف سیاسی تسلط کے ساتھ تہذیبی تسلط بھی ہندوستان میں قائم کرنے لگے اور اس طرح ہندستان میں جدید تصورات زندگی اور جدید چیزیں حاکم قوم کے ذریعے اس ترمیم کے ساتھ آئیں جس میں ان کا فائدہ ہو۔ ان کی سیاسی تہذیبی اور نسلی برتری قائم رہے۔ اس لیے ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ان نئی چیزوں اور تبدیلیوں کو ماننے سے انکار کر رہا تھا اور ان کو ماننے پر تیار نہیں تھا، نہ وہ انگریزوں کے سیاسی تسلط کو قبول کر رہا تھا اور نہ تہذیبی۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو انگریزوں کی حکومت جس نے ایک مدت بعد ہندوستان کو امن، نظم و نسق دیا تھا، بدنظمی اور انتشار سے نجات دلائی تھی اس کا استقبال کر رہا تھا مگر اس کے تہذیبی تسلط کے خلاف تھا اور اس کو ہندوستان کی تہذیب کے لیے خطرناک سمجھ رہا تھا اور وہ نئی تہذیب اور تمدن سے بھڑک رہا تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو تعداد میں بہت کم تھا اور جس کی قیادت سرسید احمد خاں کر رہے تھے جن کا کہنا یہ تھا کہ انگریزوں سے نفرت اور وحشت کے بجائے دوستی اور مفاہمت کا رویہ رکھا جائے۔ جدید علوم و فنون سے واقفیت حاصل کی جائے اور نئے زمانے کے نئے تقاضوں کو سمجھ کر ترقی یافتہ اور مہذب بنا جائے اور انگریز جن چیزوں کی کمی کی وجہ سے ذلیل اور حقیر سمجھ رہے ہیں ان کو حاصل کیا جائے اور ہندوستانیوں، خاص طور سے مسلمانوں کو خود کو نئے زمانے میں رہنے کے قابل بنانا چاہیے۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو معرکہ ہوا تھا اس میں مسلمان پیش پیش تھے۔ انگریزوں پر یہ بات واضح تھی کہ انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی ہے اس لیے ان میں ان کے خلاف غم و غصہ ہے اور وہ ان کو آسانی سے حکمراں تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لیے بہ حیثیت قوم زیادہ مسلمان ان کے عتاب کا نشانہ تھے۔ مسلمان اپنی پسماندگی کی وجہ سے نئی چیزوں اور نئے تصوراتِ زندگی کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مسلمان علماء کی جماعت انگریزوں کے خلاف تھی اور اسی کے ساتھ جدید تصوراتِ زندگی کو بھی ان ہی سے متعلق سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کے بھی خلاف تھے۔

مغربی اور جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا رویہ نئے زمانے کی طرف

ایک ہی تھا۔ انھوں نے اپنے مذہب اور تہذیب کو چھوڑے بغیر انگریزی زبان اور مغربی علوم کو سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ بنگال کے ہندوؤں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی مغربی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی اور جدید علوم کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اس لیے انگریزوں کا اثر اور دور دورہ بنگال کی طرف پہلے ہوا تھا اور انھیں انگریزوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی تہذیب سے واقفیت ہو گئی تھی۔ ان تحریکوں کا اثر بھی تھا جو ہندو سماج میں بیداری پیدا کرنے کے لیے شروع ہوئی تھیں جیسے آریہ سماج اور برہمو سماج۔ ان کا مقصد مذہب کے نام پر سماج میں طرح طرح کی توہمات اور غلط رسوم اور تصورات کی اشاعت ہو رہی تھی، اس کو ختم کرنا تھا۔

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے جو ۱۸۲۴ء میں کاٹھیاوار میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا حصہ سیر و سیاحت میں صرف کیا اور ویدک تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں انھوں نے ہندو سماج میں بیداری شرع کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی جو آریہ سماج تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ ملک میں تعلیم کی اشاعت کی اور عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے پر زور دیا۔ قدامت پرستی کی شدید مخالفت کی۔

برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے جو ۱۷۷۲ء میں رادھا نگر مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے اصلاح معاشرے کے لیے یہ تحریک شروع کی۔ اس کے ذریعہ انھوں نے ہندو مذہب میں جو فرسودہ رسوم آ گئی تھیں ان کی مخالفت کی۔ مورتی پوجا کی مخالفت کی، ستی کے رسم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ذات پات کے فرق کو مٹایا اور مجموعی طور پر ہندو سماج میں روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی اور قوم کو اس کا احساس دلایا کہ یہ جدید زمانہ ہے اور اس کے تقاضے اب کچھ اور ہیں اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے ان کو اپنانا ضروری ہے۔ انھوں نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنا دینے پر خاص زور دیا۔

بہ حیثیت مجموعی ہندو سماج نے انگریزوں کی حکومت اور ان کے تہذیبی تسلط کو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے قبول کر لیا۔

مسلمانوں، خاص طور سے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کا رویہ انگریز دشمن تھا۔ وہ مغربی تہذیب اور تعلیم دونوں سے بیزار تھے۔ اس لیے جو جدید زمانہ شروع ہو رہا تھا اس کی طرف ان کا رویہ شدید مخالفانہ تھا اور ان کی حالت بھی بہت خستہ تھی۔ پورا نظام دم توڑ چکا تھا

اور نئے نظام میں ان کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے اور ان میں ذہنی انقلاب لانے کی سب سے بڑی تحریک سر سید احمد خاں نے شروع کی۔

سر سید احمد خاں دہلی کے ایک معزز خاندان میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں وہ بجنور میں صدر امین تھے۔ انھوں نے غدر میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریزوں کی جان بچائی۔ یہ ان کی وفاداری کا بھی تقاضا تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے نوکر تھے۔ دوسرے ہندوستان میں انگریز حکومت کا قائم ہونا اس کے امن و امان اور خوشحالی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ ان کو اس وفاداری کے سلسلے میں حکومت سے خلعت اور پولیٹکل پینشن عطا کی اور جاگیر بھی دینا چاہی تھی مگر سر سید نے وہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ وہ اپنی قوم کی بدحالی اور اس کے مستقبل کو تاریک دیکھ رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے جو انسانی جانوں کی تباہی دیکھی اس کا بھی ان کے دل پر اثر تھا۔ اس یورش کو انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس نازک وقت میں قوم کی دستگیری کریں گے۔ اس کی ابتداء انھوں نے ایک کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھ کر کی۔ اس کتاب میں انھوں نے اس 'بغاوت' کا بہت حد تک ذمہ دار خود انگریز حکومت اور اس کی غلط پالیسیوں کو ٹھہرایا اور یہ بتایا تھا کہ اگر وہ یہاں حکومت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا طریقہ کار بدلنا پڑے گا جب ہی ان کو کامیابی حاصل ہو گی۔ سید احمد خاں سے ویسے انگریز حکومت خوش تھی، ان کو اپنا وفادار جانتی تھی۔ اس پر انھیں پورا اعتماد تھا مگر اس وقت تو انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں سے بھی مخالف آواز اٹھے اسے دبا دو۔ سر سید نے اس کا اہتمام کیا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت ہندوستانیوں کے بجائے زیادہ سے زیادہ انگریزوں میں ہو۔ اس کتاب کو پڑھ کر انگریز حکومت کے اراکین سخت برہم ہوئے اور سر سید احمد خاں کے لیے سخت سزائیں تجویز کرنے لگے مگر چند سمجھ دار لوگوں نے اسے انگریز حکومت کے حق میں سمجھا اور اس کی روشنی میں اپنی پالیسیوں پر غور کرنے کی تجویز کی۔

سر سید نے مسلمانوں میں بیداری پھیلانے کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم اور تہذیب کو اختیار کریں۔ نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں، ان کا

مقابلہ کریں، انگریزوں کے ذریعہ جونئی ایجادات اور تصوراتِ زندگی آرہے ہیں ان کو قبول کریں اور اپنی پسماندگی دور کریں۔ ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف تنظیمیں قائم کیں۔ اخبار اور رسالے نکالے۔ اسکول قائم کیے۔ اینگلو محمڈن کالج قائم کیا جو بعد میں یونیورسٹی بنا۔ انھوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ جا کر مختلف مقامات پر لیکچر دیے۔ ان سے بھی دلوائے۔ اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ وہاں ایک سال رہے۔

سرسید کی یہ تحریک سرسید یا علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور ادبی پہلو تھے۔

سرسید کی اس تحریک کے تحت اردو ادب میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ سرسید نے یہ آواز اٹھائی کہ ادب کو قوم کی اصلاح کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ اس کو قوم کی ترقی کی راہ دکھانے میں اپنا رول ادا کرنا چاہیے۔ ادب کے ذریعے نئے خیالات اور تصورات زندگی کی ترویج ہونی چاہیے۔ اس کا کینوس وسیع ہو۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ادب فقط ایک طبقے کی تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد وقت گزاری ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہمیں مغربی ادب کے نئے تصورات بلکہ اصناف بھی مستعار لے کر اسے اپنے یہاں رائج کرنا چاہیے۔ ادب انسانی زندگی کی تفسیر اور اس کا آئینہ دار ہے، اس لیے جب زندگی میں تبدیلیاں آرہی ہیں تو ادب میں بھی تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ سرسید کے ان خیالات کے اثر سے ان کے ساتھ دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے ان خیالات کو عام کیا اور ادب میں ان تبدیلیوں کو لانے کی کوششیں کرنے لگے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اردو ادب کا دامن وسیع ہو اور وہ معاشرے میں نئے خیالات اور تصورات کو لانے میں معاون ہو، اور بقول ڈاکٹر عابد حسین:

> ''انیسویں صدی کے آخری تہائی صدی اردو ادب میں دور انقلاب کا حکم رکھتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت مغلیہ کے زوال اور غدر کے ہولناک واقعات نے مسلمانوں کے سر سے بادہ شبابہ کے نشہ کو دور کر دیا تھا۔ ان کا ادب جو خیالی زندگی کے خوشگوار خوابوں میں مگن تھا اس طلسم کے ٹوٹنے سے چونکا اور آنکھیں مل مل کر واقعی زندگی کی حقیقت کو دیکھنے لگا۔ خیال آرائی کی جگہ حقیقت نے لے لی۔''[1]

......اور دیکھتے دیکھتے ادب کی صورت حال بدل گئی۔ شاعری جواب تک صرف غزل، قصیدہ اور مرثیہ تک محدود تھی اس میں ایک نئی صنف کا اضافہ ہوا، یعنی نظم و پرانی اصناف سخن میں اصلاح اور جدتیں ہونے لگیں۔ نثر میں داستانوں کی جگہ ناول نے لے لی جس میں اب طوطا مینا، جنوں پریوں، دیوزادوں کے قصے ہی بیان نہیں ہوئے بلکہ عام لوگوں کی زندگی اور ان کے مسئلے ان کا موضوع بننے لگے۔ بقول یوسف سرمت:

> ''ہندوستان کی زبانوں نے وقت کے تقاضوں کا جواب دینے کے لیے نئے طرز فکر، نئے تصورات اور نئے خیالات کو جگہ دی اور فکر و خیال کی اس جودت نے ادب کی اصناف میں تبدیلی کا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے نئے اصناف ادب کی ضرورت پڑی۔ اس ضرورت کے نتیجے کے طور پر ناول کی صنف وجود میں آئی۔''[۲]

اس صنف ادب کو اردو ادیبوں نے فروغ دیا اور دیکھتے دیکھتے بڑی تعداد میں ناول لکھے جانے لگے۔ ان ناولوں کا موضوع زیادہ تر سماجی مسئلے ہوتے اور ان کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہوتا۔ یہ لوگ باقاعدہ اپنی ناولوں کو 'اصلاح اور معاشرتی' ناولوں کا عنوان دیتے اور اس کے شروع میں اس قسم کی وضاحت ہوتی کہ اس ناول کا مقصد مغربی تہذیب کی حمایت یا اس کے برے اثرات، پردہ کی خرابیاں اور اس کے برے نتائج یا اس ناول کا موضوع تعلیم نسواں ہے۔ اس طرح یہ لوگ نئے خیالات اور تصوراتِ زندگی کو جو نئے زمانے کے ساتھ بدل رہے تھے۔ ان ناولوں میں قصوں کے ذریعے بیان کرتے اور ان قصوں کو حقیقی فضا میں مقامی ماحول اور جانے پہچانے کرداروں کے ساتھ ناول میں پیش کیا جاتا۔ اس لیے وہ باتیں جو تقریروں، مضامین وغیرہ کے ذریعہ لوگوں میں عام کی جارہی تھی اور لوگ ان سے بھڑک رہے تھے یا ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھ رہے تھے۔ جب وہی باتیں انسانی زندگی کے اندر ڈھال کر جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعہ مانوس فضا کے ساتھ بیان کی جاتیں تو لوگوں کے دل پر اس کا زیادہ اثر ہوتا اور نہ معلوم طور پر وہ ان سماجی

---

[۱] راشد الخیری بہ حیثیت مصلح نساں، علامہ راشد الخیری۔ پروفیسر وقار عظیم۔ (مرتبہ) محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۱۲۳۔۱۲۴

[۲] بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۶

برائیوں کا نقشہ دیکھتے تو انھیں اپنی زبوں حالی کا احساس ہوتا اور دوسرے اس کے مقابلے میں نئے خیالات اور نئے انداز کی زندگی کا نقشہ نظر آتا تو وہ قدرتی طور پر اس کی طرف مائل ہوتے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔ نذیر احمد نے جب اپنا پہلا ناول مرۃ العروس لکھا تو اس کے دو کردار اصغری اور اکبری لوگوں کو اس قدر حقیقی معلوم ہوئے کہ لوگ دہلی کے گلی کوچوں میں یہ پوچھتے پھرتے تھے کہ اکبری اور اصغری کہاں رہتی ہیں۔ افتخار عالم بلگرامی نذیر احمد کی سوانح عمری حیات النذیر میں لکھتے ہیں۔

"بعض لوگ دہلی میں اصغری اکبری کے مکان ڈھونڈتے ہوئے آنکلتے ہیں۔
وہ سمجھتے ہیں کہ سچ مچ اصغری اکبری ہو کر گزری ہیں۔"[1]

اس طرح اردو ناول نے ہندوستان معاشرے کی اصلاح میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔

ہندوستان میں جدید خیالات کی آمد نے ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی مختلف تحریکیں شروع ہوئیں۔ سماج میں ان کی ابتر حالت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ بہت سے مصلحین نے زبردست طور پر عورتوں کے حقوق کی حمایت کی اور سماج کو بیدار کیا کہ وہ عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اردو ناول نے نمایاں رول ادا کیا۔ شروع سے اس نے اس موضوع کو اپنے یہاں اولیت دی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اردو ناول کی ابتداء ہی اس ضرورت کے پیش نظر ہوئی کہ اس سے اصلاح نسواں کا کام لیا جائے۔ اس لیے اگر ہم اردو ناول کا مطالعہ کریں تو کسی نہ کسی طرح کبھی براہ راست کبھی بالواسطہ طور پر اردو ناول نے عورت کی سماجی حیثیت کو اپنا موضوع بنایا اور اس کے ذریعے عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

قبل اس کے کہ ہم شروع سے اردو ناول کے اس نظریے کا جائزہ لیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیکھیں کہ جس زمانے میں یہ ناول لکھے گئے ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت کیا تھی، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھیں کہ ہندوستان میں جن مذاہب

---

[1] حیات النذیر، شمسی پریس، دہلی ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۴

کے ماننے والے لوگ بستے ہیں ان میں عورت کا کیا مقام ہے کیونکہ اس کا عورت کی سماجی حیثیت سے گہرا تعلق ہے۔

دوسرا باب

مختلف مذاہب میں عورت کا مقام

☆ ہندو مذہب میں عورت کی حیثیت

☆ جین مذہب میں عورت کا تصور

☆ اسلام میں عورت کا مقام

☆ عیسائی مذہب میں عورت کی حیثیت

☆ زرتشت یا پارسی مذہب میں عورت کا مقام

دوسرا باب

مختلف مذاہب میں عورت کا مقام

ہندو مذہب میں عورت کی حیثیت:

ہندوستان بہت قدیم ملک ہے، ساتھ ہی بہت وسیع بھی۔ مذہب کی اس ملک میں ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے۔ مذاہب میں عورت کو کیا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کا بہت کچھ اثر سماج میں عورت کے رول اور حیثیت پر پڑا ہے۔ ہندو مذہب ہندوستان کا سب سے قدیم مذہب ہے۔ اس میں عورت کو جو درجہ دیا گیا ہے اس سے اس کی سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے کہ ہندو مذہب میں عورت کا کیا مقام ہے۔ آریوں کی آمد سے پہلے دراوڑی تہذیب میں عورت بھی خاندان کی سربراہ ہوتی تھی اور سماج میں اس کو اہمیت حاصل تھی اور اس کی عزت کی جاتی تھی۔

جہاں تک ویدک کال کا تعلق ہے اس میں ہمیں عورت کی حیثیت بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مذہبی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتی تھیں اور ایک حد تک ان کا مساوی درجہ تھا۔

"Women occupied an honourable and exalted position in the house Grihapatni was ragarded as the ornament of the house and enjoyed perfect equality with the husband in relegious and social activities."[1]

رگ وید میں عورتوں کی یہ خوبی بھی بیان کی گئی ہے کہ مردوں کے مقابلے ان کا مذہبی عقیدہ زیادہ پکا ہوتا ہے، دوسری خوبی اس کا ماں ہونا ہے اور وہ بچوں کی نگہداشت مردوں

1-Vedic Society and Religion. Prof. Natrajan. An Outline of cultural History of India-- Abdul Latif. Hyderabad. 1958. P-19

سے بہتر کر سکتی ہے۔

"Ye many women are more firm and better than the man also turns away from God and offer not."

اور

"About the ideal of mother he has many noble sentiments to express that a mother does very many acts for the son therefore he must constantly serve her though she in fallen."[1]

رزمیہ ادب میں بھی عورت کو آنر دیا گیا ہے کہ مرد کی نیکیوں کا بہت کچھ انحصار عورت پر ہے اور وہ اس کی دلچسپی اور خوشی کا ذریعہ ہے۔ خوشحالی کی دیوی کی وجہ سے بھی عورت کی اس لحاظ سے عزت کرنا ضروری ہے۔ اس کو بہت احتیاط سے رکھنا چاہیے۔ اس میں نیکیاں ہیں اور عورت گھر کی زینت ہے۔ مہابھارت میں بھی عورت ذات کو اس طرح سراہا گیا ہے۔

"The nursing of the children already born and accomplishment of all deals necessary for the needs of society all those have women for their cause. Man is therefore required to bend his will before that of his wife and to serve her and to adore her."[2]

رامائن کی سیتا اس زمانے میں عورت کی حیثیت کی عکاسی کرتی ہے جس کی بڑائی یہ ہے کہ اس نے شوہر کے ساتھ جنگلوں میں تکلیفیں اٹھائیں۔ راون کے پاس رہ کر بھی وہ شوہر کی وفادار رہی اور جب سماجی دباؤ میں آکر شوہر نے الگ کر دیا تو انھوں نے تنہائی کی زندگی گزاری اور اگنی پریکشا دی۔

اگر اس پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس زمانے میں عورت کی سماجی حیثیت ہمیں بہتر نظر آتی ہے۔ اس میں بھی عورت کی زندگی مرد کے گرد گھومتی ہے اور اس کا اپنا الگ کوئی وجود نظر نہیں آتا ہے۔ وہ مرد کی ذات کا حصہ ہے اور بعض جگہ تو یہ تصور بھی ہے کہ عورت کی تخلیق بعد میں ہوئی، مرد کی پہلے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے

1- Rigveda 61-64. The status of women in Ancient India- by Prof. Inder M.A.

2- Status of women in India by Indera. Page-6

عورت کو تخلیق کیا گیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور واضح ہوتا گیا اور عورت کی حیثیت وقت کے ساتھ ساتھ گرتی چلی گئی گو کہ منو کے اس قسم کے فقرے بغیر سیاق وسباق کے دہر ادہر اکر جب تب یہ ثابت کیا جاتا رہا کہ عورت کی حیثیت ہند و مذہب میں بہتر ہے۔

''دنیا کے اولین قانون ساز نے کہا تھا، جس گھر میں عورت کی پرستش ہوتی ہے وہ دیوتاؤں کا مسکن ہے۔''[1]

مگر ہوا یہ کہ عورت کی ذات سے بے شمار عیوب منسوب کر دیے گئے۔ طبقاتی تقسیم میں سب سے کم درجہ شدر طبقہ کو ملا تھا اور ان کو وید مقدس کے پڑھنے کی اجازت نہیں رہی۔ مذہبی قربانیوں میں وہ شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی مخالفت عورت کے لیے بھی تھی۔ منو دھرم شاستر کی رو سے عورت کو باپ کے زیر فرمان رہنا چاہیے۔ اس کے بعد جوانی میں شوہر اور شوہر کے انتقال کے بعد بیٹوں کے۔ وہ خود مختار کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا تصور صرف بٹی، بیوی اور ماں کا ہے۔ اس کو ان حیثیتوں میں مثالی ہونا چاہیے۔ خاص طور سے بیوی کے رول میں۔ اسے زیادہ سے زیادہ وفادار، بے زبان ہونے کا حکم ہے۔ اس کا دھرم شوہر کی خدمت ہے اور یہی اس کی نجات کا وسیلہ ہے۔

وہ ایک جائیداد ہے جو ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ باپ جوان ہونے پر اور بعض صورتوں میں جوانی کی شرط بھی نہیں ہے، یہ کہنا چاہیے کہ ہوش سنبھالنے پر وہ کنیادان کر کے شوہر کو دان کر دیتا ہے۔ پھر وہ پوری عمر شوہر کی تابعداری کرتی ہے۔ ماہواری کے وجوہ سے عورت کو گندہ تصور کر لیا گیا اور فرض کر لیا کہ چونکہ اس کو ماہواری آتی ہے اور مرد کو نہیں آتی ہے اور ماہواری سے گندگی کا تصور وابستہ ہے اور مرد اس سے بہتر ہے اس لیے اس کو مرد سے کم تر درجہ قرار دے دیا گیا۔ ماہواری اور زچگی کے دنوں میں مذہبی رسومات سے الگ رہنے کے حکم نے اس تصور کو اور تقویت دے دی کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ شادی کرنا اور ماں بننا ہی اس کی زندگی کی معراج ہے۔ شوہر اور بیٹے سے ہی اس کی سماج میں عزت اور اہمیت ہے۔ اس کو اپنی ازدواجی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نشانیاں

---

[1] شیام سندر چاولہ، ہندو مذہب میں عورت کی حیثیت۔ یوجنا نومبر ۱۹۸۸ء، ص۔ ۱۷

استعمال کرنا ضروری ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ کنواری ہے، بیاہی یا بیوہ ہے۔ شوہر کی سلامتی کے لیے اسی پر برت رکھنا لازم کیا گیا۔ بیوگی عورت کے لیے ایک قہر الٰہی کے برابر مصیبت ہے جس کی ذمہ دار اس کو قرار دیا گیا اور اسے منحوسیت یا اشبھ ہونے کا تصور وابستہ کرلیا گیا ہے۔ اسی لیے ان کو کسی خوشی کی جگہ سے الگ رکھا جاتا اور ان کی موجودگی خوشی کی تقریبوں میں بری سمجھی جاتی۔ ان رسومات میں شامل ہونا تو خیر بڑی بات ہے ان پر زندگی کی خوشیوں کو حرام کردیا جاتا تھا۔ جب کہ ان مردوں کو جن کی بیویاں نہ ہوں نہ منحوس سمجھا جاتا نہ ان پر زندگی کی خوشیوں کو حرام کیا گیا نہ ان کو دوسری شادی کی مخالفت ہے۔ جب کہ عورتوں خاص طور سے اونچی ذات کی عورتوں کے لیے بیوگی کی صورت میں شادی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ منوسمرتی میں بار بار اس پر زور دیا گیا ہے کہ عورت زندگی کے کسی اسٹیج پر خودمختار ہی نہیں ہے۔ اس کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیے جو اس کے شوہر کی پسند کے خلاف ہو۔ اس کو شوہر کے مرجانے کی صورت میں فاقے پر فاقے کرنا چاہئیں۔ اپنی غذا شدھ پھول، ان کی جڑیں اور پھل کھانے چاہئیں۔ دوسرے مرد کا خیال بھی دل میں لانا گناہ ہے۔ زیادہ تر اپنا وقت پوجا پاٹ میں گزارنا چاہیے۔ مردوں کو ہدایت کی گئی کہ انھیں عورت پر پورا کنٹرول رکھنا چاہیے۔ جن عورتوں کی نگہبانی نہیں کی جاتی ہے وہ خاندانوں کے لیے تباہی لاتی ہیں۔ منو میں عورت کو لالچی چرتر بری فطرت کا بتایا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب عورت بالغ ہو تو اسے اس کی رقم لے کر شوہر کے حوالے کردینا چاہیے۔

"The women who is not unfaithful to her husband but restrains her mind and heart, speach and body reaches husband's worlds (after death) and good people call her virtuous women (30) But a women who is unfaithful to her husband is an object of reproach in the world (than). She is reborn in the womb of the jackal and is formented by the disease (born) of (her) evil."[1]

عورت کو کھیت کہا گیا ہے اور مرد کو بیج۔ اس سے عورت کی حیثیت کم تر فرض کرلیا گیا اور یہاں بھی وہ ایک چیز ایک کموڈٹی سمجھ لی گئی۔ پوری کتاب پڑھ جائیے، وہاں عورت کا روپ اسی طرح نظر آتا ہے کہ کبھی وہ کسی کے حصے میں آئی کبھی کسی کی جائیداد بن کر ایک

دوسرے کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔

"The bed and the seat, jewellery, lust, anger, crookedness, a malicious nature, and bad conduct are what manu assigned to women."[2]

دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ،

"A wife who drink wine behaves dishonestly or is rebellious, ill, violent or wasteful of money may be superseded at any time.(81)[3] A barren wife may be superseded in the eighth years; one whose children have died in the tenth; One who bears (only) daughter's in the eleventh; but one who says unpleasant things (may be superseded) immediately.(82)"[4]

اس سے ثابت ہوا کہ بچوں کے نہ ہونے اور لڑکیوں کے ہونے کی ذمہ داری عورت پر ہے اور یہ اس کی کمی جس کی بناء پر شوہر کو اسے چھوڑنے کی اجازت ہے۔ منو نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف زور زبردستی سے عورت کی نگہبانی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ان کو گھر کے کاموں میں ہمیشہ مصروف رکھنا چاہیے اور ان کو خوش رکھنے کو پیسہ اور زیور دے دینا چاہیے۔

مردوں کی اہمیت اور عورت سے اس کی برتری کو اس طرح ذہن نشیں کیا گیا ہے۔

"A man wins a world through a son, and he gains eternity through a grandson, but he reaches the summit of the chestnut horse through the grandson of his son."[1]

اسی طرح منو عورت کی

1- The Laws of Manu., Translated by Wendy Doniger with Brain K. Smith 1991 Penguin Books.

2- The Laws of Manu, Page No. 198

3- The Laws of Manu, Page No. 207

4- The Laws of Manu, Page No. 207

"The most central and common identity envisaged for women was wifehood. Infact, the nature of wifehood was elaborated at length. As we see the ideal process for becomming a wife involved a certain denial of a woman's personhoods."[2]

اوراس کالب لباب یہ ہے کہ اس کو ہر صورت میں اپنے شوہر کی تابعداری کرنا ہے۔ یہی اس کا فرض ہے۔

"She has to obey her husband in life and death even if he was devoid of qualities.[3]

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جب ہندو مذہب میں بہت کٹرپن اور قدامت پرستی پیدا ہو گئی تو ان کے ردّ عمل کے طور پر بدھ مت اور جین مت وجود میں آئے۔

"Buddhism and Jainism were instrumental in bringing about not only religio-philosophical upheavals in the country but sociological changes as well."[4]

اوراس کا اثر عورت کی سماجی حیثیت پر بھی پڑا۔ جین مذہب اور بدھ مذہب کا عورتوں کی مذہبی حیثیت پر اس لیے بھی فرق پڑا کہ ان مذہبوں کی تعلیم عام زبان میں ہوئی تھی۔

بدھ مذہب اور عورت:

بدھ مذہب نے عورتوں کی سماجی حیثیت میں بہتری پیدا کی۔ بنیادی طور پر ان کے مہاتما بدھ نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر نہیں سمجھا ہے۔ چونکہ ان کا نظریہ لبرل تھا اس لیے عورتوں کے سلسلے میں وہی بات کارفرما تھی۔ انھوں نے مرد عورت دونوں کو

1- The Laws of Manu, Page No. 214

2- Women and the Hindu Right "Where women are worshipped" Edited by Tanika Sarkar & Urvashi Butalia, P-22

3- The Laws of Manu, Page No. 54

4- Women Status in Ancient India" Women under Buddhism their Social Status(Chapter XIII)P-183.

Dhamma دیا اور اس میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ لڑکی کی پیدائش غم، غصے اور دکھ کا سبب نہیں تھی۔ بچے کی دعا میں یہ تخصیص نہیں ہوتی تھی کہ لڑکا ہی ہو۔ بدھ مذہب نے یہ شرط ہٹادی کہ صرف بیٹا ہی ماں باپ کی آخری رسومات ادا کرے گا۔ اس سے قدرتی طور پر بیٹے کی اہمیت اور قدر کم ہوئی۔ اب بیٹا نجات کا وسیلہ بھی نہیں رہا۔ مہاتما بدھ کے نزدیک جس کے بیٹا نہ ہو وہ بھی نروان حاصل کرسکتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں صرف لڑکے کے ساتھ لڑکی کو بھی گود لیا جاسکتا ہے۔ شادی ہونا بدھ نے ناگزیر نہیں ٹھہرایا۔ عورتیں اگر چاہیں تو غیر شادی شدہ رہ سکتی ہیں اور وہ چاہیں تو مذہبی کاموں میں خود کو مصروف رکھیں۔ چاہیں تو سماجی کاموں میں مشغول ہوں۔ ان کے غیر شادی شدہ ہونے سے ان کی سماجی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ گھر کا مالک تو مرد ہے اس کا ہی حکم چلے گا مگر عورت اگر نیک ہو، خوبصورت ہو، لڑکے والی ہو، اچھے خاندان کی ہو تو اس کو بھی گھر پر حکمرانی کا حق ہے۔ ایک سے زیادہ شادی کو پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے۔ لبِ لباب یہ ہے کہ بدھ مذہب نے ہندو مذہب کے عائد کردہ سخت اصولوں نابرابری اور عورت کے ضمنی حیثیت کے تصور میں تو کسی قدر لچک پیدا کی۔ مہاتما بدھ کے زمانے میں اور اشوک کے زمانے میں جب بدھ مت پورے عروج پر تھا عورت کی سماجی حیثیت میں کچھ فرق بھی ہوا۔

جین مذہب میں عورت کا تصور:

جین مذہب نے بھی مذہبی لحاظ سے عورت کی تفریق کو ختم کیا۔

"According to Jain tenets, any holy man or woman who strictly follows five great vows can become sadhu or sadhvi."[1]

اور جین مذہب کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ عورتیں دنیا کو چھوڑ کر سادھو بن گئیں اور اپنی زندگی پوجا پاٹھ میں گزاری۔ اس طرح شادی کرنا جین مذہب نے عورت کے لیے لازمی قرار نہیں دیا ہے۔ اسی طرح اگر مقابلہ کیا جائے تو جین عورتوں نے مذہبی طور پر اپنے کو مذہب سے زیادہ جوڑا، نسبتاً بدھ عورتوں کے۔ اس سے کسی نہ کسی حد تک عورتوں کی

1-Status of Women in Ancient India Page-253

سماجی حیثیت پر بھی اثر پڑا۔ جیسے بیواؤں کی حالت اس حد تک زار نہیں تھی۔ جین مذہب نے شوہر کے مرنے کے بعد عورت کو اس کی جائیداد کا مالک بنایا ہے۔ اس کو اسے پوری طرح خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر وہ manage نہ کر سکے تو پھر بیٹا اس کا مالک ہے۔

"Jain Law - books cited, Put it beyond doubt, that a jain woman has an absolute and unrestricted power of enjoyment and disposition of her husband's property."[1]

اس طرح سے بیوی کو شوہر کی وراثت کا حق مان کر کسی حد تک عورت کی حیثیت کو اوپر اٹھایا۔ مگر مجموعی طور پر عورت کی حالت میں بہت زیادہ سدھار نہیں ہو سکا اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر یہ بات کیا کم ہے کہ ان دونوں مذاہب نے عورت کی دبی کچلی اور نچلی حیثیت کو کسی حد تک اوپر اٹھانے کی کوشش کی اور اس طرح ان تحریکوں کے لیے راہ ہموار کی جن سے ہندو معاشرے میں زیادہ روشن خیالی پیدا ہوئی اور عورت کی سماجی حیثیت بہتر ہوئی۔

اسلام میں عورت کا مقام:

اسلام مذہب عرب میں سب سے پہلے آیا۔ اس سے پہلے عرب قوم کی سماجی حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ لوگ نہایت قدامت پرست تھے۔ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ عرب سماج میں ویسے تو عورتوں میں تھوڑی سی تعداد ایسی تھی جو آزاد اور خود مختار تھیں۔ شاعری کرتی تھیں، تعلیم حاصل کرتی تھیں، تجارت کرتی تھیں۔ اپنی پسند کی شادی کرتی تھیں۔ انھیں جنگوں میں مردوں کو جوش دلانے کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی عورت کی حالت بہت خراب تھی۔ عورت ایک جائیداد کی طرح تھی جو مالک کے بعد اس کے ورثاء میں بٹ جاتی تھی۔ وہ رہن بھی رکھی جاتی تھی۔ کچھ قبیلوں میں دختر کشی کی رسم بھی تھی۔ اس لیے کہ کسی کو اپنی بیٹی دینا ان کی شان کے خلاف تھا۔ عرب ایک جنگجو قوم تھی۔ اس لیے وہ لڑکوں کو زیادہ مفید سمجھتے تھے اور لڑکوں کی بہت اہمیت تھی۔ جنسی طور پر معاشرے میں ہر قسم کی بے راہ روی تھی۔

اسلام نے اس پر زور دیا کہ خدا کے بنائے ہوئے سب انسان برابر ہیں۔ گورے کو

1-Status of Women in Ancient India Page-266

کالے پر فوقیت ہے نہ اعلیٰ ذات والے کو کم ذات پر۔ اس نے کہا کہ انسان کی بڑائی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کتنا متقی اور پرہیز گار ہے اور اللہ والا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں ہے ایک اچھا لڑکا اور ایک اچھی لڑکی برابر ہیں۔

''اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ تم اس پر غم و غصہ اور اعتراض کرنے والے کون ہو۔''[1]

دوسری جگہ کہا گیا کہ،

''(خدا نے) سب (عورتوں اور مردوں) کو ایک نفس سے پیدا کیا۔''[2]

حضرت مریم علیہ السلام کے والدین اپنے لیے بیٹے کی دعا کرتے تھے کہ اے خدا ہمیں پاکباز بیٹا عطا کر۔ خدا نے کہا کہ ہم تم کو ان ہی صفات کی بٹی دیں گے اور پھر حضرت مریم پیدا ہوئیں۔ اسلام نے کہا،

''مسلمانو! تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ عورتوں کو (میت) کی میراث سمجھ کر ان پر زبردستی قبضہ کرلو۔''[3]

قرآن نے اپنے احکامات میں مرد اور عورتوں کو ساتھ ساتھ مخاطب کیا اور ان کی فضیلت کا انحصار نیک اعمال پر رکھا جنس پر نہیں۔

لڑکے اور لڑکیوں کو یکساں تعلیم و تربیت کا حکم دیا۔ شرم و حیا، پاکیزگی، عفت و عصمت کے لحاظ سے عورتوں کو اس بات کی تاکید کی گئی کہ اپنی زینت و زیبائش کو ظاہر نہ کریں تاکہ مردوں کی بری نظروں سے بچی رہیں۔ وہ ان پر حریصانہ نظریں نہ ڈالیں۔ ساتھ ساتھ مردوں کو شرم و حیا اور پاکیزگی کی تاکید کی گئی۔ ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور عورتوں کو گھور گھور کر نہ دیکھیں۔ بغیر شادی کے جنسی تعلقات رکھنا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ممنوع قرار دیا۔

''(اے نبی) مومنوں سے کہہ دو کہ (عورتوں سے دوچار ہونے پر) اپنی

---

1. الشوریٰ: ۴۹۔۴۲، عورت او اسلامی تعلیم ص ۲۳
2. النساء: ۱۔۴ عورت اور اسلامی تعلیم ص ۲۴
3. ترجمان القرآن ذص ۳۶۴

نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گراہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا مؤجب ہے۔ اللہ اس سے واقف ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''[1]

اور

''(اے نبی) مومنہ عورتوں سے کہہ دیں کہ (مردوں کے سامنے) وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں۔ سوائے اس کے جو (ضرورت یا مجبوری سے) کھل جائے۔''[2]

عوتوں پر غلط تہمت تراشی کی کڑی سزا رکھی۔

اسلام نے عورت کو چار دیواری میں قید رکھنے کا حکم نہیں دیا۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کے لیے باہر نکلتی تھیں۔ مسجدوں میں آ کر نماز بھی ادا کرتی تھیں اور رسول اللہؐ مسلمانوں کو مخاطب کر کے اسلام کے جو اصول بتاتے تھے عورتیں بھی انھیں سنتی تھیں۔ مسئلے بھی پوچھتی تھیں۔ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلانے، مرہم پٹی کرنے اور لاشوں کو میدانِ جنگ سے لانے کا کام بھی عورتیں کرتی تھیں۔

مرد کے ساتھ شادی کے لیے عورت کی پسند کو بھی ضروری قرار دیا۔ شادی کو ایک معاہدہ قرار دیا اور میل محبت سے نہ رہنے کی صورت میں یا بہت زیادہ اختلافات کی صورت میں وہ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔

مرد کو طلاق کی سہولت دی تو عورتوں کو خلق کا حق دیا۔

بے حساب شادیاں کرنے اور لاتعداد عورتوں سے تعلق رکھنے کے بجائے ایک وقت میں صرف چار شادیاں کرنے کی اجازت دی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ سب سے یکساں سلوک کیا جائے اور ساتھ میں یہ تصریح بھی کی کہ تم ایسا نہیں کر پاؤ گے۔

''تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہش مند ہو لیکن یہ بات تمھاری طاقت سے باہر ہے کہ (ایک سے زیادہ) عورتوں میں (خاص طور پر) عدل کر سکو۔ (کیونکہ دل کا قدرتی کھنچاؤ تمھارے بس کا نہیں۔ کسی کی طرف زیادہ کھنچے گا کسی کی طرف کم) پس ایسا نہ کرو کہ کسی ایک ہی کی طرف جھک پڑو اور دوسری کو اس طرح چھوڑ بیٹھو کہ

---

[1] النور: ۲۴۔۳۰ — عورت اور اسلامی تعلیم، ص ۲۷

[2] النور: ۲۴۔۱ — عورت اور اسلامی تعلیم، ص ۶۵

گویا 'مطلقہ' ہے یعنی ایسی عورت ہے کہ نہ تو بیوہ اور طلاق دی ہوئی کہ اپنا دوسرا انتظام کرے، نہ شوہر ہی اس کا حق ادا کرتا ہے کہ شوہر والی کی طرح ہو۔ بیچ میں پڑی لٹک رہی ہے اور دیکھو تم عورتوں میں بارے میں درستگی پر رہو اور بے انصافی سے بچو۔''[1]

دوسری جگہ اسی بات کی تصریح یوں کی:

''جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو۔ ایک وقت میں دو دو تین تین چار چار تک کر سکتے ہو بشرطیکہ ان میں انصاف کرسکو یعنی سب کے حقوق ادا کرسکو اور سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا سلوک کرسکو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر چاہیے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔''[2]

جائیداد میں لڑکے کے ساتھ لڑکی کو بھی حق دیا۔

''ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا بہت لڑکوں کا حصہ ہے اور اسی طرح ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں لڑکیوں کا حصہ بھی ہے۔ حق دار ہونے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ حصہ خدا کا ٹھہرایا ہوا حصہ ہے۔''[3]

بیوہ اور مطلقہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ تاکید کی۔ شادی کو فرض نہیں سنت قرار دیا۔ معاشرے میں بے راہ روی نہ ہو۔ جہیز کا کوئی سوال ہی نہیں۔ مرد کے لیے بے مہر کی رقم مقرر کی گئی اور یہ شرط رکھی گئی کہ یہ رقم عورت کو شادی کے تعلقات قائم ہونے کے بعد ادا کر دی جائے۔

''جن عورتوں سے تم نے ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے تو چاہیے کہ جو مہر ان کا مقرر ہوا تھا وہ ان کے حوالے کرو۔''[4]

قرآن نے صاف لفظوں میں کہا ہے۔

''عورتوں کے لیے بھی اسی طرح کے حقوق ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔''[1]

''عورتوں کے ساتھ معاشرت میں نیکی اور انصاف ملحوظ رکھو۔''[2]

---

[1] ترجمان القرآن پہلی جلد سورۃ النساء، ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۹۴
[2] ترجمان القرآن پہلی جلد سورۃ النساء، ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۹۵
[3] ترجمان القرآن پہلی جلد سورۃ النساء، ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۲۶
[4] ترجمان القرآن پہلی جلد سورۃ النساء، ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۲۲۸

اور یہ بھی تاکید کی کہ:

''انھیں دکھ دینے کے لیے مت روکو تاکہ تم ان پر زیادتی کر سکو۔'' [۳]

اور پھر یہ بھی کہا کہ طلاق کی صورت میں:

''تمھارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم دیے ہوئے (مہر میں) سے کچھ حصہ عورت سے واپس لے لو۔'' [۴]

پھر کہا:

''انھیں حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرو۔'' [۵]

عورت کے لیے خلع کا حکم دیا ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی ٹھہرائی ہوئی پابندیوں کے تحت ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکتے تو پھر ان دونوں پر گناہ نہیں کہ بیوی (آزادی) حاصل کرنے کے لیے اپنے مہر کا کچھ حصہ) بطور معاوضے کے دیدے (اور یوں آزادی حاصل کرلے)۔''

اسلام کے ابتدائی دور میں عورت نے میاں کی شکل پسند نہ ہونے کی وجہ سے بھی خلع لیا ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے:

''عورتوں سے نیک سلوک کرو، کیونکہ تم نے انھیں اللہ تعالیٰ سے بطورِ امانت لیا ہے۔'' (مسلم، کتاب الحج۔ ط)

دوسری جگہ رسول اللہ حضرت محمد ﷺ نے کہا:

''تم میں اچھا وہی ہے جو اپنے اہل (یعنی بیوی) کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔'' ماں کے قدموں کے نیچے جنت بتائی، جہاد کے مقابلے میں ماں کی خدمت کو اولیت دی۔

غرض کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کی اور اس پر زور دیا کہ عورت ایک آزاد وجود ہے۔ مرد کی ذات کا حصہ نہیں۔ عورت مرد کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ یعنی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسلام میں عورت اپنے نام کی

۱	البقرہ۔۲	ص ۲۲۸	
۲	النساء۴:۱۹	عورت اور اسلامی تعلیم	ص ۱۲۲
۳	البقرہ۲۔۲۳۱	عورت اور اسلامی تعلیم	ص ۱۶۸
۴	البقرہ۲۔۲۲۹		
۵	البقرہ۲۔۲۲۹		

وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔شوہر یا باپ کا نام لگانا ضروری نہیں ہے۔

اسلام نے عورت کو ایک بلند مقام دیا اور اس کو مرد کے مساوی حقوق دیے۔وقت کے ساتھ اپنے تہذیبی معیاروں کے مطابق زیادہ تر مردوں نے قرآن کی ایسی تعبیریں کیں جس میں عورت کے درجے کو مرد سے کمتر قرار دیا گیا۔عورتوں کے فرائض پر زیادہ زور دیا گیا اور اس کے حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا یا وہ صرف اصول بن کر رہ گئے۔ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔شرم وحیا اور عفت وعصمت اور پاکیزگی صرف عورت کے لیے ضروری قرار دی گئی۔اس کو برقرار رکھنے کا صرف یہی ذریعہ ٹھہرا کہ وہ پردے میں رہے۔ اس کی زندگی چہار دیواری میں محدود ہو جائے۔نکاح میں عورت کی مرضی اس حد تک رہ گئی کہ وہ قاضی سے نکاح کے وقت ہوں یا ہاں کہہ دے۔چاہے وہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔مرد کو یکطرفہ طلاق کا حق دیا گیا۔اس کو 'خدائے مجازی' کا درجہ دیا گیا۔خلع کے ساتھ اس قدر شرطیں عائد کر دی گئیں کہ عورت اس حق سے محروم کر دی گئی۔ بیوہ کی شادی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ہندوستان میں خاص طور سے اسے اس طرح منحوس سمجھا جانے لگا جیسے ہندو سماج میں مہر صرف شان دکھانے کو بھاری سے بھاری رقم کا مہر مقرر ہونے لگا۔اس کی ادائیگی کا کوئی سوال ہی نہیں۔عورت کو ناقص العقل قرار دیا گیا۔اس پر علم کے دروازے بند کر دیے گئے۔بار بار اس کا حوالہ دیا جانے لگا کہ قرآن میں عورت کو مرد کی کھیتی کہا گیا ہے۔اس لیے جس طرح چاہے وہ استعمال کر سکتا ہے۔تین طلاقیں رواج پا گئی ہیں۔چار شادیاں اس کا حق بن گئیں۔ماں کے پیروں کے نیچے سے جنت غائب ہو گئی...... عورت کو تین دفعہ طلاق طلاق کہہ کر الگ کر دینا رواج بن گیا۔عورت کو فتنہ وفساد کی جڑ کہا جانے لگا اور اس کے حوالے قرآن اور حدیث سے دیے جانے لگے۔آدم کو بہکا کر خدا کی حکم عدولی کرانے والی اور اس کو جنت سے نکلوانے حوا ٹھہریں جبکہ قرآن نے بار بار اس کی وضاحت کی کہ یہ کام ان دونوں نے کیا۔بار بار انھوں نے کا دو لفظ استعمال کیا۔

سورۃ البقرہ میں آدم اور حوا کے قصے کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ''پھر ایسا ہوا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیے۔یہ اس کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت اور سکون) کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے نکلنا پڑا۔''[1]

اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد سورۂ یوسف کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔''تورات

میں ہے کہ شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی۔ اس لیے نافرمانی کا جو پہلا قدم انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور عورت مرد کو سیدھی راہ سے بھٹکانے والی ہے لیکن قرآن نے اس قصے کی کہیں تصدیق نہیں کہ بلکہ ہر جگہ اس معاملے کو آدم اور حوا دونوں کی طرف منسوب کیا۔ انھیں جو حکم دیا گیا تھا وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے لیے تھا۔''[۲]

بعض مفسرین قرآن نے عورت کی حیثیت کو کمتر کرنے کی کوشش کی۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ زلیخا اور اس کی دوستوں نے جس طرح حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالے تھے اس کے بارے میں زلیخا کے شوہر نے کہا تھا، ''ہاں معلوم ہو گیا کہ یہ تم عورتوں پر چرتر لگا ہے، تم لوگوں کے چرتر بڑے ہی چرتر ہوتے۔''[۳]

اس بارے میں مولانا آزاد فرماتے ہیں: ''عزیز کے اس قول میں...... جو رائے ظاہر کی گئی ہے اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے۔ خود قرآن کا حکم نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولہ کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لیے قرآن کا یہ فیصلہ ہے اور اس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ شکار ہے اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہوشیار ہے۔''[۴]

اس کی ایک اور مثال ہے۔ قرآن شریف میں مرد عورتوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔ سورۂ مریم میں آیت نمبر ۵ میں جو عورتوں کے صفات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک صفت سائحات بھی ہے۔ مولانا سعید اکبر آبادی کے مطابق: ''اس لفظ کا مشتق سیاح اور سیاحت ہے جس کے معنی ہیں، زمین میں گھومنا اور سیر کرنا۔ اس بناء پر ہمارے نزدیک اس لفظ کے معنی ہوئے سیاحت کرنے والیاں۔ مفسرین نے عام طور پر اس کا ترجمہ الصائمون الصائمات (روزہ دار مرد اور عورتیں) کیا ہے۔[۱]

---

[۱] ترجمان القرآن سورۃ البقرہ ص ۲۳۲
[۲] ترجمان القرآن جلد دوم سورۂ یوسف ص ۲۶۶
[۳] ترجمان القرآن جلد دوم سورۂ یوسف ص ۲۴۶
[۴] ترجمان القرآن جلد دوم سورۂ یوسف ص ۲۶۵

اس لیے کہ عورتوں کی حیثیت کا نقشہ مفسرین نے بنایا ہے۔ اس سے یہ بات میل نہیں کھاتی کہ عورتوں کے لیے بھی سیاحت کو ایک مستحسن کام بتایا گیا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو مقام بخشا ہو اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور عورت کو بھی اس کا یقین ہو گیا کہ واقعی وہ ہر طرح سے کمتر ہے اور مرد کی خدمت کرنا اور مختلف حیثیتوں سے اس کی محکوم رہنا ہی اس کا مقدر ہے۔ اس سے دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی۔

عورت کو عملاً جاہل رکھا گیا تھا۔ وہ اس کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی تھی کہ وہ خود قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے اور اپنا صحیح مقام پہچان سکے۔[1]

عیسائی مذہب میں عورت کی حیثیت:

عیسائی مذہب کا جہاں تک تعلق ہے اس میں بہ حیثیت مجموعی عورت کا درجہ زیادہ گرا ہوا نہیں ہے۔ گو کہ بائبل میں عورت کو مرد کو بہکانے والی اور تحریص دنے والی بتایا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مذہبی رسومات میں مرد کے ساتھ حصہ لیتی ہے گو کہ پریسٹ نہیں بن سکتی۔ عورت گو کہ مرد کے اختیار میں ہے اور جائیداد پر بھی مرد کا پورا کنٹرول ہے مگر میاں بیوی کے آپس کے تعلق میں ایک دوسرے کی عزت اور فرض شناسی پر زور دیا گیا ہے۔ معاملہ یکطرفہ نہیں ہے۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

"God made them male and female, for this reason a man shall leave his father and mother and be joined to his wife and two become one."[2]

عیسائی مذہب میں خاندان کا تصور ایک یونٹ کا ہے اس لیے عورت کا تعلق بنیادی طور پر اس کے شوہر سے ہوتا ہے، پورے خاندان سے نہیں۔ اس کی وجہ سے شادی کے بعد عورت کو وہ ظلم و ستم نہیں سہنے پڑتے ہیں۔ عیسائی مذہب میں پردے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ باہر نکل سکتی ہے، تعلیم حاصل کر سکتی ہے، کام کر سکتی ہے۔ اسے شوہر کے ساتھ آزادی سے ادھر ادھر جانے کی آزادی ہے۔

عیسائی مذہب میں یک زوجیت یا یک زوجگی پر زور دیا گیا ہے۔ عیسائی مذہب نے عورت کی زندگی کا یہ واحد مقصد نہیں بتایا ہے۔ وہ عمر بھر شادی نہ کر کے مذہب کی خدمت کے

1۔ اسلام میں عورت کا مرتبہ و مقام — مرتبہ احسان اللہ

2- M.K. 10-69 gen 127, and 224 see above 228-31. The Principles of christian faith and Practice by charts P. Price page 273 Islam and the Modern age society Current Book House Bombay

لیے خود کو وقف کرسکتی ہے اور مذہب کی خدمت کا مطلب خدا کے بندوں کی خدمت اور ان سے محبت۔ گو عیسائی مذہب میں گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے اور بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اس کا فرض بتایا گیا ہے مگر صرف یہی نہیں۔ عیسائیوں میں تبلیغ کے کام کو بہت اہمیت ہے اور ایک عرصہ تک عیسائی مذہب کا غلبہ بھی اس معنی میں رہا کہ یہاں کے حکمرانوں کا مذہب عیسائی تھا اور ان کو تبلیغ مذہب کی چھوٹ تھی۔ اسکولوں، کالجوں میں انجیل اور بائیبل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لیے بہت سے مسلمان خاص طور سے غریب طبقے کے لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا اور جب یہاں کے مختلف فرقوں نے اس مذہب کو اختیار کیا تو اس کی روایات عیسائیت کے ساتھ خلط ملط ہوگئیں۔ اس کے باوجود عیسائی عورتوں کی حالت ہندوستان کی مسلم اور ہندو عورتوں سے بہتر تھی، کیونکہ ان کے لیے تعلیم کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اس لیے وہ ملازمتیں بھی کرتی تھیں۔ نرسیں، ڈاکٹر، استانیاں وغیرہ عیسائی عورتیں بھی ہوتی تھیں اور اس کا اثر دیر سویر ہندوستانی عورتوں کی سماجی حیثیت پر بھی پڑا۔

زرتشت یا پارسی مذہب میں عورت کا مقام:

اس مذہب کے لوگ پارسی کہلاتے یا آتش پرست۔ پارسی مذہب میں عورت کا درجہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی وغیر مذہبی تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ باپ کی جائیداد میں بھی اس کا حق ہے۔ اس کو شوہر سے طلاق لے کر دوسری شادی کرنے کا حق ہے۔ ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت ہے۔

ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اثر سے پارسی لوگوں نے اس کی مخالفت کرنا شروع کی مگر پارسی پنچایت نے اس کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ انیسویں صدی میں اس کی مخالفت نے زور پکڑا اور ان رواجوں کو ختم کر کے چھوڑا۔ پارسی عورت کو آتش کدے میں مردوں کے ساتھ جا کر عبادت کی اجازت ہے۔ غیر مذہب میں اگر مرد شادی کرے تو اس کو مذہب سے خارج نہیں کیا جاتا۔ وہ پارسی رہتا ہے اور اس کے بچے بھی پارسی ہوتے ہیں مگر اس کے برعکس اگر عورتیں غیر مذہب میں شادی کرلیں تو ان کو مذہب سے نکال دیا جاتا ہے اور ان کو آتش کدے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مگر مجموعی طور پر پارسی عورت اور مرد کے حقوق میں بہت زیادہ تفریق نہیں ہے۔

تیسرا باب

انیسویں صدی میں ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت

☆ اقوامِ عالم میں عورت کا مقام

☆ ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت

تیسرا باب

انیسویں صدی میں ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت

اقوامِ عالم میں عورت کا مقام:

جب ہم سماج کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شروع سے ہی عورت کو مرد نے اپنا محکوم رکھا ہے۔ اس کی بڑی وجہ عورت کا جسمانی طور پر مرد کے مقابلے میں طاقتور نہ ہونا، اس کے دل کی نرمی اور رحم دلی، اسی طرح اس کی دوسری خصوصیات یعنی اس کا ماں بننا، جذباتی طور پر مردوں پر انحصار کرنا۔ ان ہی چیزوں سے فائدہ اٹھا کر مرد عورت کا حاکم اور نگہبان بن بیٹھا۔ آر۔ بریفولٹ (R. Brifault) کی رائے ہے کہ بنی نوع انسان میں محبت کا جذبہ ابتداء سے عورت ہی میں محدود تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''غایت درجہ کی مادرانہ محبت وحشی قبائل کی عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس کی بہتیری مثالیں پیش کی ہیں۔ عورت کے دل میں محبت کا جذبہ آہستہ آہستہ وسیع ہوتا رہا۔ اس کے اندر اپنے شوہر کی محبت پیدا ہوئی اور وہ ترقی کرتی رہی۔ چنانچہ ایسی اقوام میں بھی جن میں مرد اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ بیویاں اپنے شوہر کے ساتھ غایت درجہ کی مخلصانہ محبت رکھتی ہیں۔ اس کی مثالیں مختلف اقوام کے نیم وحشی قبائل میں بہت عام ہیں۔''[1]

نیم وحشی قبائل کا کیا سوال ہے۔ یہ مثالیں تو مہذب سماج میں بھی کم یاب نہیں ہیں۔ ظلم و زیادتی کے انداز مختلف ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس فارمولا سے کام لینا تو انسان کا شروع سے وطیرہ تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی حیثیت سے کم تر دیکھ کر اپنا غلام بنالیا اور وہ اس

---

[1] عورت اور مرد کا مقام اقوامِ عالم میں۔ پروفیسر زبیر صدیقی، نذر ذاکر، مجلس نذر ذاکر، نئی دہلی۔ ص ۳۸۰

کی تجارت کرنے لگا۔ اس کا سرا شخصی حکومت سے ملتا ہے جہاں طاقتور اپنی طاقت سے فرد کو نہیں پوری قوم کو اپنا غلام بنالیتا ہے اور اس پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ جہاں فرد کو کسی قسم کی آزادی نہیں ہوتی اور اس کی جان و مال کا مالک ایک فردِ واحد ہوتا ہے۔ وہ اس کے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ مرد نے صرف عورت کو کمتر سمجھا اور اس کو بھی یہ یقین دلادیا کہ وہ اس سے ہر لحاظ سے کم تر ہے۔ جیسا کہ محمد زبیر صدیقی کہتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ جب مرد نے اپنی جسمانی طاقت اور اعلیٰ دماغی صلاحیت کی وجہ سے عورت پر غلبہ حاصل کیا ہے تو اس نے عورت کے فطری حقوق اس سے سلب کر لیے اور اسے تحصیل علم سے اور اپنے دماغی قویٰ کو ترقی دینے سے محروم رکھا۔ آہستہ آہستہ چین میں، ہندوستان میں ویدک زمانے کے بعد یونان، میں اور سارے مغربی ممالک میں عورت کے خلاف سخت متعصبانہ خیالات پھیل گئے۔''[1]

یہی نہیں اسے یہ بھی باور کرایا گیا کہ وہ ہر بات میں مرد کی مرہونِ منت ہے۔ مثلاً ماں بننا اس کی سب سے بڑی خوشی، سب سے بڑی عزت کی بات ہے مگر بغیر مرد کے وہ ماں نہیں بن سکتی اور پھر یہ بات کہ مرد اس کو ماں بنادیتا ہے مگر ماں بننے کے سارے مراحل وہ اکیلی ہی طے کرتی ہے اور اس کے بعد بھی بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ مگر بچے کا مالک باپ ہوتا ہے اور جب چاہتا ہے وہ عورت کو ماں بنا کر بچے کے باپ ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور عورت کو بغیر باپ کے بچہ پیدا کرنے کی رسوائی بھی سہنی پڑتی ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کو ماہواری آتی ہے۔ اس کو گندگی سے منسوب کرکے عورت کو گندہ سمجھا جانے لگا اور یہ تصور کیا جانے لگا کہ عورت کے ساتھ یہ سب وبال ہیں جن سے مرد آزاد ہے۔ اس لیے مرد برتر اور عورت کمتر ہے اور عورت کے لیے اس قسم کی خیال آرائیاں کی جانے لگیں کہ: ''عورت احمق اور متلون مزاج ہوتی ہے۔ اسے ترقی دینا خدائی قانون اور فطرت کے خلاف ہے۔''[2] روسو جو آزادی اور مساوات کا بہت بڑا علمبردار تھا، عورت کو مرد کی خادمہ ہی سمجھتا تھا، لکھتا ہے: ''عورتوں کی تعلیم ہمیشہ مردوں کی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیے تاکہ وہ ہمیں خوش رکھے۔ ہمارے لیے مفید ہو۔ ہمارے اندر اپنی محبت

---

[1] عورت اور مرد کا مقام اقوام عالم میں۔ پروفیسر زبیر صدیقی، ندرزا کر، ص ۳۸۵

[2] یہ مقولہ خیر سے اسکاٹ لینڈ کے ایک مصلح قوم کا ہے۔ بحوالہ عورت کا مقام اقوام عالم میں، ندرزاکر، محمد زبیر صدیقی۔ ص ۳۸۴

اور وقعت پیدا کرے۔ ہمیں مشورہ اور تسکین دے، ہماری زندگی مسرت آمیز بنائے۔ یہی عورت کے دائمی فرائض ہیں، اسی کے لیے اسے تعلیم دینا چاہیے۔"[1] جب انسان تعلیم یافتہ نہیں تھا اس نے اپنا سماج نہیں بنایا تھا۔ اس کے قوانین نہیں بنائے تھے۔ اس وقت تک عورت مرد کے ہاتھوں تکلیفیں تو اٹھاتی تھی، ظلم و زیادتی بھی سہتی تھی مگر اس کی حالت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ اس کو اپنے قبیلے اور خاندان میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس کی رائے اہم معاملوں میں مانی جاتی تھی۔ جب انسان سماج کی تعمیر کر رہا تھا اس زمانے میں عورت نے ہی رہائش کے لیے خیمے اور جھونپڑے بنائے، کھانے پینے کا سامان مہیا کیا۔ مرد کی حاصل کی ہوئی چیزوں کو کھانے کے قابل بنایا۔ چمڑے کی کارآمد چیزیں بنائیں۔ درخت کی چھال کے ریشوں سے کپڑے تیار کیے، چکن زردوزی، کوزہ گری، ٹوکری سازی اور بعض دوسری صنعتیں ایجاد کیں۔ ان مصنوعات کے تبادلے اور فروخت کرنے کا انتظام کیا۔ اس کے لیے قاعدے مقرر کیے اور انھیں نافذ کیا۔ عورت ہی ابتداً معالج اور جراح ہوتی تھی۔"[2]

انسانی معاشرے کی ابتداء میں خاندان کا کوئی تصور نہ تھا۔ عورت مرد جھنڈ بنا کر رہتے تھے اور اپنی دوسری اور ضرورتوں کی طرح جنسی ضرورت بھی بلا کسی قید اور تخصیص کے پوری کر لیتے تھے۔ بچے بھی سب کے ہوتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ انسان نے کچھ ضابطے پیدا کیے اور بچے ماں کے نام سے جانے جانے لگے۔ پھر زراعت کا فروغ ہوا۔ مرد نے اپنی فوقیت قائم کرنی شروع کر دی اور یہیں سے عورت کا استحصال شروع ہوا۔

اسی طرح جب سماج بنا اس کے اصول وضع کیے گئے تو عورت کو سماج میں کمتر حیثیت ملی اور اس کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ وہ کم تر ہے۔ ایسے مفروضے گڑھ لیے گئے کہ عورت جسمانی طور پر مرد سے کمزور ہے۔ اس کا بھیجا چھوٹا ہوتا ہے، عقل کم ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بھاری کام اس آسانی سے نہیں کر پاتی جس آسانی سے مرد کرتے ہیں اس لیے اس کے لیے بھاری کاموں کی منادی کر دی گئی۔ جسمانی طور پر بڑا ہو جانا بڑائی کی نشانی سمجھ لی گئی۔

عورتوں کے لیے پردہ ضروری قرار دے دیا گیا اور ان کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا اور باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ تازہ ہوا اور کھلی فضا کو ترس گئیں۔

---

[1] EMILE 263,5 بحوالہ عورت اور مرد کا مقام اقوام عالم کے میں، ص ۳۸۵

[2] عورت اور مرد کا مقام اقوام عالم میں۔ پروفیسر زبیر صدیقی، نذر ذاکر، ص ۳۸۱

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ "پردہ کی رسم مسلمان اپنے ساتھ لائے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے ڈر سے اپنی عورتوں کو پردہ کرانا شروع کردیا۔"[1]

لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ تاریخ میں برابر اس کے ثبوت ملتے ہیں کہ ویدوں کے زمانے سے ہندوستان میں پردے کا رواج تھا۔ منو میں لکھا گیا ہے کہ: "عورت کو دن رات خاندان کے مردوں کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔"[2]

عورت کے کاموں کو مخصوص کردیا گیا اور وہ بظاہر اتنے مشکل نہیں تھے جتنے مردوں کے کام۔ مثلاً روزی کمانا جو عام طور پر محنت طلب کام کرکے کمائی جاتی تھی۔ حفاظت کرنا، ہتھیار چلانا، بے رحمی سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا وغیرہ۔ اس کے مقابل میں ے کھانا پکانا، بچے پالنا اور ایسے ہی گھریلو کام جو عورت کو کرنے کے لیے دیے گئے وہ آسان تھے۔ اس لیے مرد نے برتری حاصل کرلی۔ اب بھی دیہاتوں میں یا قبائلی علاقوں میں عورت مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہے اور روزی کماتی ہے۔ وہاں عورت کی اتنی بدتر حالت نہیں ہے جیسی شہر اور قصبوں میں رہنے والی مڈل کلاس اور اپر کلاس عورتوں کی ہے۔

اور عورت کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ وہ مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ اس کی آسودگی اور مسرت فراہم کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کو مرد کے تابع فرمان رہ کر، گھر کی چاردیواری میں بند رہ کر گھرداری کرنا ہے۔ بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرنا۔ عورت کو خود اس کی کمتری کا احساس دلا دلا کر اس کو یقین دلا دیا گیا کہ وہ **Weaker Sex** ہے اور اس کا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ اس کو ہر قسم کی مذہبی اور سماجی تعلیم سے محروم رکھا گیا۔ اس لیے وہ علوم وفنون میں مردوں سے بہت پیچھے ہوگئی اور پھر یہ فارمولا بن گیا کہ عورتیں محدود صلاحیتوں اور کم ذہن دماغ کی مالک ہیں۔ "زیادہ تر محققوں نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت میں تخلیقی اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔"[3]

معاشرے میں مرد اور عورت کے الگ الگ اخلاقی معیار وضع ہونے لگے۔ جس میں

---

[1] **M Hurschfeld/Wvmen East and West" P-160** بحوالہ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ ڈاکٹر شمیم نکہت

[2] **M Hurschfeld/Wvmen East and West" P-160** بحوالہ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ ڈاکٹر شمیم نکہت

[3] عورت مرد کا رشتہ۔ کشور ناہید۔ ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۳

عورت پر ہر قسم کی پابندیاں اور مردوں کو ہر قسم کی آزادی مل گئی۔ بقول مل (Mill) کے:

''سماج میں ایک ناکارہ مرد کو ایک ذہین اور تیز عورت پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ مرد ہے۔''[1]

اس کی واحد خصوصیت اس کا مرد ہونا ہی ہے۔ مردوں نے مذہبی احکامات کی بھی تفسیر اور تعبیر ان ہی اصولوں کے تحت کر کے عورت کو اس کا یقین دلا دیا کہ وہ ہر طرح مرد سے کمتر ہے اور اس کو قدرت نے اسی طرح بنایا ہے کہ وہ اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرے۔ شوہر کی وفادار اور تابعدار ہو۔ اس کی دنیا اور آخرت کو سنورنے کا انحصار مرد کی خوشنودی ہے۔ عورت کو خود اپنی اس حیثیت کا اتنا یقین ہو گیا کہ وہ اسی میں شاد اور مست رہنے لگی اور ظلم و ستم، ناانصافی کو اپنا مقدر سمجھ کر برداشت کرنے لگی یا پھر بعض عورتوں نے مردوں کو بس میں کرنے کے لیے کچھ ایسے حربے استعمال کرنے شروع کر دیے جو بظاہر اس کے حق میں تھے۔ اس کی اہمیت کو بڑھاتے تھے۔ مرد کی توجہ حاصل ہوتی تھی مگر خود اس کی ذات کی نفی کرتے تھے۔ جیسا کہ منو نے کہا ہے کہ عورتوں کو زیورات کی دولت سے مالا مال کر دو اور گھر کے کاموں میں اس کو اس قدر مصروف رکھو کہ اس کو شوہر کی تابعداری کے علاوہ اور کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اسی طرح عورتیں مردوں کے لاڈ پیار حاصل کر کے ناز نخرے کرنے لگیں اور زیوروں کے کھلونے سے خود کو بہلانے لگیں۔ ان کو گھر کی رانی اور ملکہ کہہ کر بے وقوف بنایا جاتا رہا اور اس کا درجہ اس سے برتاؤ غلام کا سا ہوتا ہے''۔[2] اسی لیے اس کے کام اور ناک چھیدنے کا رواج شروع ہوا۔

عورت کو غلام سمجھنے کا مسئلہ عالمگیر ہے اور عرصہ دراز سے رائج ہونے کی وجہ سے اس کو فطری سمجھا جانے لگا۔ عورتوں کو جب اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کے مواقع نہیں ملے تو ان کے اندر کی صلاحیتیں خوابیدہ ہو گئیں اور زندگی کے میدان میں مرد کا راج ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود مختلف وقتوں میں مختلف مقامات پر خال خال ہی سہی اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کیے اور یہ ثابت کیا کہ اگر مواقع فراہم ہوں تو وہ بہت کچھ کر سکتی ہیں چاہے وہ حکومت کے تخت ہوں یا میدانِ جنگ، مسند علم ہو یا بیماروں کی خدمت۔ وطن کی راہ میں

---

[1] جان اسٹورٹ مل، محکومیت نسواں مترجم مولوی معین الدین ۱۹۳۹ء۔ جید پریس

[2] عورت مرد کا رشتہ۔ مرتبہ کشور ناہید ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء ص ۲۴۰

جان قربان کرنے کا معاملہ یا ظلم کے خلاف پرچم بلند کرنے کا حوصلہ اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قدرت نے عورت کو مرد سے مختلف ضرور بنایا ہے مگر کمتر نہیں۔ اس اختلاف کو کمتری کا درجہ مرد نے دیا ہے۔

سماج میں عورت کی کم تر حیثیت کم و بیش پوری دنیا میں ہی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں چین میں **Chen Hung Mou** نے کہا تھا کہ:

"There is no one in the world who is not educated and there is no one whom we can offord not to educate why be neglectful only in regard to girls, Just leaving infancy they are raised and protected deep in the woman's quarters; they are not like the boys who go out with fellow and outside and who benefit from the encouragement of teacher and friends, When girls grow older they embroider to proper their dowries and that is all."

یہی حال یورپ میں تھا کہ عورتوں اور مردوں کے فرائض الگ تھے۔ مرد روزی کمانے والا تھا اس لیے اس کو برتری حاصل تھی۔ اس کی ابتداء ۱۸ ویں صدی میں اس طرح ہوئی کہ جب صنعتی ترقی ہوئی، فیکٹریاں وجود میں آئیں، صنعتیں قائم ہوئیں۔ قصبے شہروں میں اور شہر بڑے بڑے شہروں میں تبدیل ہونے لگے۔ مردوں اور عورتوں کے فرائض بھی الگ الگ ہو گئے اور یہ خیال فروغ پانے لگا کہ مرد روزی کمانے والا ہے اس لیے برتر ہے۔

bread wniner اور **housewife** کی اصطلاحیں وجود میں آئیں۔ مرد اور عورتوں کی دنیا الگ ہو گئی۔ عورتوں کے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع نہیں تھے۔ ان کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ ان پر اسکول اور کالجوں کے دروازے بند تھے۔ درور جینا وولفنے **Room of one`s own** لکھا جس میں یورپ میں عورت کی کم تر حیثیت پر بالواسطہ روشنی ڈالی۔ اس نے کہا کہ: ''فرض کیجیے اگر شیکسپیئر کی کوئی بہن ہوتی تو وہ بھی

1- Some Question on Feminism and its relevance in South Asia- Kamla Bhasn & Night Said Khan- kali for women. 1984

اتنی ہی جینیس ہوتی۔ اسے تھیٹر سے ایسی دلچسپی ہوتی تو یقیناً اس کو وہ مواقع نہ میسر آتے جو شیکسپیئر کو مرد ہونے کی وجہ سے حاصل تھے۔ اسی طرح کتنی ہی باصلاحیت ذہین عورتیں گمنامی کے پردے میں رہیں اور ختم ہو گئیں۔'' خود ورجینا وولف کو اسکول اور کالج میں باقاعدہ تعلیم نہ پانے کا غم تھا۔ یورپ میں عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے خلاف شدید تعصب تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان میں ان کی شرکت ۱۸۷۰ء تک ممنوع تھی۔ عورتوں کے کالجوں کے قیام کے بعد ان کے خلاف طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی تھیں۔ یونیورسٹی ڈگری ۱۹۴۸ء تک نہیں دی جاتی تھی۔ یونیورسٹی یونین کی رکنیت کا حق تو ان کو ۱۹۶۲ء کے بعد ملا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی تعلیم نسواں کی تاریخ کم و بیش کیمبرج جیسی ہی ہے۔ عورتوں کی طبی تعلیم کی خاص طور پر شدید مخالفت کی گئی۔ ممتحن نے امتحان لینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹروں اور سرجنوں کے کالج کے صدر نے تقسیم انعام کے ایسے جلسوں میں شرکت سے انکار کر دیا جس میں کسی لڑکی کو انعام دیا جا رہا ہو۔ فرانس، جرمنی اور امریکہ میں بھی انیسویں صدی کے وسط تک عورتوں کی تعلیمی پستی کا یہی حال تھا۔[1]

ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ویدک کال سے پہلے اور ویدک کال کو چھوڑ کر عورت کی سماجی حیثیت نہ صرف کمتر بلکہ خراب تھی۔ اس کا عورت ہونا اس کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ مگر خال خال ایسی عورتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص رول سے بغاوت کر کے جو اسے سماج نے دیا تھا مذہبی اور سماجی زندگی میں اپنا مقام بنایا۔

میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں کیے۔ ملکی معاملوں میں حکمرانوں کی مشیر بنیں اور خود حکومت بھی کی۔ مذہبی اور سماجی علوم حاصل کیے، بھگوان کی بھگت بن کر بھگتی کے نغمے گائے۔ دوسری طرف پردے کے نام پر چار دیواری میں مقید ہوئی، بچپن میں شادی کر دی گئی، بیوہ ہونے پر سخت صعوبتیں سہیں۔ یہاں تک کہ شوہر کی چتا میں اس کو زندہ جلا دینے کا رواج ہوا اور اگر زندہ رہی تو وہ زندگی موت سے بدتر تھی۔ زندگی کی خوشیوں کے سب دروازے اس پر

---

[1] عورت اور مرد کا مقام اقوام عالم میں۔ پروفیسر زبیر صدیقی، نذر ذاکر، ص ۳۸۴

بند کر دیے گئے اور ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جانے لگا کہ اس نے زندہ جل کر مر جانا قبول کر لیا۔ اس کا الگ کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ مرد کی ذات کا حصہ ہے۔ اس کا اسے یقین دلا دیا گیا۔ زندہ رہے تو مرد کے لیے اور مرے بھی مرد کے لیے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ اولاد نہ ہونے یا صرف بیٹی ہونے پر اسے معتوب کیا جاتا۔ تعلیم کے دروازے اس پر بند تھے۔ قرآن شریف اور منو دونوں میں اسے مرد کی کھیتی کہا گیا تو اس کی یہ تفسیر کی گئی کہ مرد کی جاگیر اور جائیداد ہے۔ وہ جیسے اور جس طرح اسے استعمال کرے وہ انسان نہیں شئے ہے۔

عیسائی مذہب میں آدم کو بہکا کر جنت سے نکالنے والی حوا کو کہا گیا ہے اور اسی بات نے عورت کی حیثیت کو نیچا درجہ دینے میں بہت رول ادا کیا ہے۔ عورت گناہ کی جڑ سمجھی جانے لگی۔ زر زمین کے ساتھ فساد کی جڑ عورت کو مان لیا گیا۔ وہ ناقص العقل ہے، اس کی عقل ایڑی میں ہوتی ہے۔ مردوں کو زیادہ سے زیادہ شادی کی اجازت تھی۔ خاص طور پر بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں، مہاراجاؤں، جاگیرداروں اور تعلقداروں کو، اور عورت کے لیے نہ طلاق کی صورت میں نہ بیوگی کی صورت میں دوسری شادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیٹی تھی، بہن تھی، بیوی تھی یا ماں تھی۔ وہ خود نہیں تھی۔ لوک گیت، شادی بیاہ، بچے کی پیدائش اور زچگی کے گیتوں میں عورت اپنے دکھ درد کو بیان کرتی تھی جن میں وہ کہیں بانجھ ہونے کی وجہ سے گھر سے نکال دی جاتی تھی اور اس کو زمین بھی اپنے میں سمانے سے انکار کر دیتی ہے کہ وہ بانجھ ہو جائے گی۔ کبھی وہ روتی دھوتی اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی تھی۔ اس نصیحت کے ساتھ کہ جس گھر میں تمھاری ڈولی جا رہی ہے وہیں سے تمھارا جنازہ بھی اٹھنا چاہیے۔ وہ خود کو چڑیا اور گائے تصور کرتی تھی کہ جہاں جی چاہتا اس کو ہانک دیا جاتا۔ اس کو ہدایت تھی کہ شوہر کی خدمت عبادت سے زیادہ اہم ہے۔

"The main purpose of marriage left women as a mere machine of reproduction of male child...... women neither had property rights nor were allowed any religious studies. Women's confinement to the four walls is well known. After marriage when the girl entered in the in-law's house she was welcomed on the first day as 'laxmi', the

'goddes of money' but later was treated as the chattel."[1]

اپنی عصمت کی حفاظت کرنا عورت کا پہلا فرض تھا۔ مگر مرد اس سلسلے میں آزاد تھا اور عورت کو مردوں کے بنائے معاشرے نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ مرد پر کسی اخلاق کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ وہ مرد بچہ ہے، وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ عورت مرد کی دنیا اس قدر الگ الگ تھی کہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں اس دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں تھی اور اسے یہ ہدایت بھی تھی کہ وہ خبر نہ رکھے کہ باہر مرد کیا کر رہا ہے۔ یہ جاننا اس کے لیے بالکل ضروری نہیں ہے۔ اس لیے مرد کو اس کی پوری آزادی تھی کہ وہ بیاہتا بیوی کو گھر کی چار دیواری میں بند کر کے خود طرح طرح کی عورتوں سے دل بہلائے اور ان کا استحصال کرے۔ اس کے نتیجے میں جو اولاد ہو وہ ناجائز کہلائے اور اس کو معاشرے میں کوئی جگہ نہ ملے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہر قسم کی ذلت ورسوائی برداشت کرے۔ یہ چیزیں اس قدر عام تھیں کہ اگر کوئی مرد یہ نہ کرتا تو یہ اس کی بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ نوابوں، جاگیرداروں، تعلق داروں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کے محلوں اور حویلیوں میں عورتیں مہارانیوں، بیگمات اور بیویوں کی حیثیت سے کیا کچھ نہ سہتی تھیں اور لونڈیوں، باندیوں، مہریوں، رکھیل کی حیثیت سے بھی ان کا ہر قسم کا استحصال ہوتا تھا۔ یہ عیش پسند لوگ شادیاں کرنا کھیل سمجھتے تھے اور چھوڑی ہوئی عورتوں پر ہر قسم کے ظلم کرتے تھے۔ ان کے علاوہ عورتوں کو بھی طرح طرح کی ناانصافیاں سہنی پڑتی تھیں۔ بدچلنی کے شبہ پر ان کی ناک تک کاٹ لی جاتی تھی۔ جان لینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

''صدیوں کے اس جبر و احتساب نے عورت کی سائیکی ہی بدل کر رکھ دی۔ وہ حسین، لطیف اور جنس نازک کہلائی۔ شرم و حیا کا زیور، بچوں کی پیدائش اس کا ذمہ، امور خانہ داری میں مہارت اس پر فرض، مرد کی خوشنودی اور طابع داری اس کا سنگار ٹھہرا۔ اس طور پر وہ اپنے مجازی خدا کی تابع مہمل بن کر رہ گئی۔''[2]

دنیا بھر کی طرح ہندوستان میں طوائف کا پیشہ ابتداء سے ہی موجود تھا۔ اس کا چلن ویدوں کے وقت سے ہندوستان میں بھی تھا اور ان کو سماج میں ایک مقام حاصل تھا۔ ان کو

1- The Bhakti Movement and the status of women by Leela Mullati Publications, 9189 Page-2

۲۔ خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب، عتیق اللہ، اردو ادب کی دین، دہلی اکادمی۔ ص ۵۶

اپسرا کہا جاتا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ، شاعری، آدابِ محفل اور امورِ سلطنت کی ماہر ہوتی تھیں۔ ان کا کام مردوں کا دل بہلانا تھا۔ ان کے ذوقِ جمال کو تسکین پہنچانا تھا۔ عام خواتین کو ان سے الگ رکھا جاتا تھا اور اس طرح پردہ کرایا جاتا تھا کہ جیسے مردوں سے شریف بیبیوں کو چار دیواری میں قید کر کے ان پر شرافت کا تمغہ لگا کر ان کو گھریلو ذمہ داریوں اور نسل کے فروغ کے لیے اولاد پیدا کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ باہر دل بہلانے اور تفریح طبع کے لیے اس طرح کی عورتوں موجود تھیں۔ اس طرح عورت صرف مرد کی تفریح خدمت اور اس کی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ تھی۔

دوسری طرف کچھ عورتوں کو دیوداسی بنا کر مندروں میں رکھ دیا جاتا تھا اور پجاری اور مہنت ان کا استحصال کرتے تھے۔ وش کنیا ہوتی تھیں جن سے جاسوسی کا کام لیا جاتا تھا۔ مغلیہ دور میں جو نظامِ تعلیم تھا کہ گھریلو مکتبوں میں لڑکے اور ان کے ساتھ چھوٹی بچیاں بھی تعلیم حاصل کرتیں۔ پھر ذرا بڑی ہوتیں تو ان کو گھرداری کی تعلیم دی جاتی تھی اور کسی نہ کسی حد تک ان کی تعلیم ہو جاتی تھی مگر جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے کہا کہ ''انیسویں صدی کے آخر میں گردشِ روزگار نے اس نظام کو درہم برہم کر دیا۔ ایک طرف اقتصادی مشکلات، یعنی ذرائع آمدنی بڑھنے سے ضروریاتِ زندگی میں بھی اضافہ ہوا اور گھر کی پرسکون فضاء میں خلل پڑ گیا۔ دوسری طرف انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے اثر سے مردوں اور عورتوں کی زندگی کی راہیں الگ ہو گئیں۔ عام مدرسوں کے کھل جانے کے بعد گھر کے مکتب بند ہو گئے۔ لڑکے تو اسکولوں میں پڑھنے لگے مگر لڑکیاں پردے کی وجہ سے وہاں نہیں جا سکیں۔ اس لیے ان کی تعلیم موقوف ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مستقل جہالت نے عورتوں کی حالت کو بہت پست کر دیا۔''[1] اس کے بعد تعلیم نسواں کی کوشش شروع ہوئیں تو اس کی راہ میں بہت سی مشکلات تھیں اور اس کی بڑی وجہ سماج میں عورت کی سماجی حیثیت تھی۔ ۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشن کی رپورٹ میں اس سلسلے میں لکھا ہے ''ہندوستان میں تعلیم نسواں کی راہ میں بعض مشکلات حائل ہیں۔ یہ مشکلات کچھ تو اس وجہ سے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے لڑکوں کی تعلیم پر توجہ دینے کی ایک مدت بعد اس

---

[1] ڈاکٹر عابد حسین۔ مصورِ غم بہ حیثیت مصلح نسواں علامہ راشد الخیر۔ ص ۱۲۷۔ ۱۲۸

معاملے پر توجہ دی لیکن سب سے بڑی دقت جو اس بارے میں پیش آئی ہے وہ بالا دست طاقت کے کسی قسم کی کارروئی کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ خود لوگوں کے رجحان سے تعلق رکھتی ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آبادی کے زنانہ حصے میں اس امر کی خواہش مطلق نہیں پائی جاتی کہ حصولِ تعلیم کو ذریعہ معاش بنایا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کمسنی کی شادی کا رواج ہے وار خوشحال طبقے کی عورتیں اپنی شادی شدہ زندگی حد درجہ پردے میں بسر کرتی ہیں۔''[1]

پردے کی پابندی کی وجہ سے عورتوں کو چار دیواری میں قید کر دیا جاتا تھا۔ وہ تازہ ہوا کو ترستی تھیں۔ اکثر صورتوں میں وہ گھر کے کھلے آنگنوں اور دالانوں میں بھی کم ہی رہ پاتی تھیں۔ چونکہ ان کا گھر میں آنے والی عورتوں سے بھی پردہ کرایا جاتا تھا جس کے لیے وہ باورچی خانوں یا گھر کی اندھیری کوٹھریوں میں چھپ جاتی تھیں۔ پھر غذا میں بھی لڑکے اور لڑکیوں میں فرق کیا جاتا تھا۔ بڑی ہو کر وہ اس بات کو خوشی سے قبول کر لیتی تھیں کہ اچھی طاقتور غذا مردوں کو کھانا چاہیے۔ اسی لیے عورتیں زیادہ تر تپ دق میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ بچہ ہونے کے زمانے میں ان کو اچھی غذا اور ورزش اور اچھے ماحول اور طبی امداد کے بجائے گنڈے تعویز کیے جاتے تھے۔ بچہ کی ولادت ایک اندھیری کوٹھری میں دائیوں کی مدد سے ہوتی تھی اور اکثر صورتوں میں عورتوں کی موت ہو جاتی تھی۔ اس گھٹی ہوئی فضا میں رہ کر لڑکیاں ہسٹریا کے مرض میں مبتلا ہو جاتی تھیں اور اس کو جن اور بھوت کا اثر سمجھ کر ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ اس زمانے کے اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کی شادی اس قدر عام تھی کہ پانچ سال کے بچے بچیوں کی شادی کر دی جاتی تھی اور اگر لڑکا مر جاتا تو وہ معصوم بچی بال ودھوا ہو جاتی تھی۔ اور یہ سمجھے بغیر کہ شادی کے کیا معنی اور مفہوم ہیں وہ بڑی ہو کر نہ صرف ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے محروم رہتی تھی بلکہ اس پر انسانی زندگی کی عام خوشیاں بھی حرام تھیں یا پھر بلوغت سے پہلے ان پر ازدواجی زندگی کا بار پڑ جاتا اور وہ اکثر صورتوں میں اس کو نہ سنبھالنے کی صورت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ شادی بھی عورتوں کی زندگی تباہ برباد کر دیتی تھی۔ جس میں حسب نسب،

---

[1] ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولس کا حصہ۔ سیمیں فضل ص ۹۹

ذات برادری، گوتر کی اہمیت ہوتی تھی۔ اگر یہ صفت مرد میں موجود ہے تو آنکھ بند کر کے لڑکی اس کے سپرد کر دی جاتی تھی چاہے اس کی عمر کتنی بڑی ہو، بیمار ہو، مریض ہو، بدچلن ہو۔ عورتوں کے یہ ذہن نشین تھا کہ ان کی زندگی کا مقصد شوہر کی تابعداری ہے۔ اس قسم کی روایتیں مشہور کر دی گئی تھیں کہ شوہر نے اپنی بیوی سے پانی مانگا اور جب تک وہ پانی لائے شوہر سو گیا تو بیوی رات بھر اسی طرح پانی لیے شوہر کے سرہانے کھڑی رہی۔ صبح فرشتے نے آ کر اسے جنت کی بشارت دی یا ایک دفعہ شوہر کام سے آیا تو بیوی نے جلدی سے لوٹے میں پانی دیا، وہ ٹھنڈا تھا، شوہر بگڑ گیا۔ دوسرے دن گرم پانی دیا تو بھی خفا ہوا۔ آخر کو اس بیوی نے دوسرے دن ایک لوٹے میں ٹھنڈا پانی رکھا ایک میں نیم گرم اور ایک میں گرم۔ اس طرح ایک اچھی بیوی کی پہچان یہ تھی کہ وہ شوہر کی نظر کو پہچانے۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانا، ان کو طرح طرح کی اذیتیں دینا سماج میں ایک عام بات تھی۔ نچلے طبقے میں بہت زیادہ عورتوں کو مارا پیٹا جاتا تھا۔ مگر متوسط اور اعلیٰ طبقے میں بھی یہ مرض عام تھا۔ شوہر کی مار کو خواتین اس طرح سہہ لیتی تھیں کہ جیسے یہ ان کی ازدواجی زندگی کا حصہ ہے۔ نچلے طبقے کے ایسے مرد کو اگر کوئی برا بھلا کہتا تو عوتیں بڑے ناز سے کہتیں کہ مارا تو کیا ہوا، پیار بھی تو کرتا ہے۔ گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں بھی ان عورتوں کو جن کے شوہر ان کو مارتے تھے اس طرح سمجھاتی تھیں، زبان مت چلایا کرو، تم ایسا کرو ہی کیوں جو شوہر کا ہاتھ اٹھے، یعنی ہاتھ اٹھنا بہت نارمل اور نیچرل بات ہے۔ بچوں کی نگہداشت، پرورش، بیماری، دکھی کی ساری ذمہ داری ماں کی تھی اور ان پر حق باپ کا۔ اس کے بارے میں سارے فیصلے باپ کے ہوتے تھے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان میں مختلف مقامات اور طبقوں میں عورت کی حیثیت الگ الگ تھی۔ قبائلی علاقوں میں جہاں مادری نظام تھا ان مقامات سے جہاں پدری نظام رائج تھا مختلف تھی۔ نچلی ذات کی عورتیں باہر مرد کو روزی کمانے میں مدد دیتی تھیں۔ متوسط طبقے کی عورتیں گھر میں رہ کر وقت ضرورت روزی پیدا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے بعض خاندانوں میں گھر کے فیصلوں میں اسے بالکل قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں لونڈیوں اور باندیوں کی حیثیت سے ان کا استحصال ہوتا تھا۔ خاص طور سے

جاگیرداروں، تعلق داروں اور نوابوں میں۔ ان کی اور ان کی اولاد کے ساتھ نہایت حقارت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ نوکروں سے بدتر ان کے ساتھ سلوک ہوتا تھا اور ان کی نسبت نہایت حقارت آمیز فقرے کس کر ان کو ذلیل کیا جاتا تھا۔ اور ان کو کبھی یہ بھولنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ کسی لونڈی، کسی مہترانی، کسی دھوبن اور کنجرن کی اولاد ہے۔

اس کے علاوہ مردوں نے ایک طرف تو عورت کو چار دیواری میں محصور کر کے عصمت وعفت کا لبادہ اڑھا کر اپنی جائز اور صحیح النسل اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا تھا، اس کی حیثیت ان کی جاگیر اور جائیداد کی تھی۔ دوسری طرف اس کو طوائف بنا کر کوٹھوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ظاہری حسن و جمال سے بس گانے بجانے، شعر و شاعری میں طاق ہو کر ان کے تسکین اور ذوقِ نظر دونوں کا سامان مہیا کرتی تھی اور ان کے کوٹھے عیش و نشاط کے مرکز تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کی اس قدر اہمیت ہوگئی تھی کہ شرفاء اپنی اولاد کو وہاں اچھے طور طریقے سیکھنے کو بھیجتے تھے۔

اس طرح مجموعی طور پر ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت بہت پست تھی۔

ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں جو دھیمی رفتار سے آ رہی تھیں، انیسویں صدی کے اوائل میں اس میں تیزی آ گئی اور اسی کے ساتھ زندگی کا تصور بدلنے لگا۔ ایک تہذیب کی جگہ دوسری تہذیب نے لینی شروع کر دی۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھا کہ بدلتے ہوئے معاشرے میں عورت کی حیثیت کیا ہو؟ بہت کچھ مشنری عورتوں کی فلاح و بہبود کی انجمنیں اور ہندوستانی اسکول کھولنے کا اثر بھی پڑا۔ کچھ مصلحین نے اس پر زیادہ توجہ کی اور اس پر زور دیا کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ عورت کی سماجی حالت بھی بہتر ہونا چاہیے اور خاص طور سے مسلمان عورت کو جو حقوق مذہب نے دیے ہیں وہ اسے ملنے چاہئیں جن سے نہ عورت واقف ہے نہ مرد۔ ہندو عورتوں کی سماجی بہبودی کے لیے بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ستی، بچپن کی شادی کی مخالفت، جائیداد میں اس کے حق کی حمایت ہونے لگی۔ جہاں تک انگریز حکومت کا سوال تھا اس نے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے قدم اٹھائے مگر جب سماج میں عورتوں کے حقوق کی آواز اٹھی تو اس میں ضرور اس نے مدد کی۔ کچھ محسنینِ قوم نے بھی اپنی تحفظ پسندی کی وجہ سے عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی

تحریک کی کھل کر حمایت نہیں کی مگر ایسے لوگ بھی تھے جو اس کو قوم کی ترقی کے لیے نہایت ضروری سمجھتے تھے پھر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی عورتوں کی آزادی کی لہر زور پکڑ رہی تھی۔ اس کا اثر بھی ہوا اور ہندوستان میں تحریک نسواں شروع ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس میں تیزی آئی۔

چوتھا باب

آزادیٔ نسواں کی تحریک

چوتھا بلب

آزادیٔ نسواں کی تحریک

جدید خیالات اور نئے زمانے کی آمد سے عورتوں کی خراب حالت کا احساس لوگوں کو ہونا شروع ہوا اور دنیا بھر میں عورتوں کی آزادی اور ان کو مرد کے برابر سمجھنے کی تحریکیں شروع ہوئیں۔

آزادیٔ نسواں کے لیے انگریزی میں لفظ Famanism استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ سترہویں صدی میں استعمال ہونا شروع ہوا اور اس کی توجیہیں اور اس کے مطلب الگ الگ وقتوں اور ملکوں میں الگ الگ لیے گئے۔ مثلاً سترہویں صدی میں اس کا ایک مطلب تھا تو اٹھارویں صدی میں دوسرا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ حالات اور پس منظر کا بہت کچھ دخل ہے۔ ابتداء میں اس کا تصور محدود تھا اور وقت کے ساتھ اس میں وسعت آتی گئی۔

عورتوں کی آزادی کی تحریک چلانے والے ابتداء میں مرد ہی تھے جیسے چین میں کنگ یووی (King Yu Wei) جنھوں نے عورتوں کے پیر باندھ کر چھوٹے کرنے پر احتجاج کیا۔ احمد فیروز ایل شیڈیارک (Ahmed Fared Shydyark) اور کاظم امین (Kazim Amin) مصر میں، ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے، ودیا ساگر، رام کرشنا، رابندر ناتھ ٹیگور، الطار حسین حالیؔ، گاندھی، سجاد حیدر یلدرم، مولوی ممتاز، خواجہ غلام الثقلین۔ ان آوازوں نے عورتوں کی منجمد زندگی میں تموج پیدا کیا۔

ایک جرمن فلسفی کورنیلیاس اگریپا (Cornelias Agrippa) نے عورت کی خوبیوں پر ایک رسالہ لکھا جس میں اس نے دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے نہ صرف مرد اور عورت کو برابر ٹھہرایا بلکہ بعض باتوں میں اس کی فضیلت ثابت کی۔ آل وائیوس (S.L. Vives) نے عورت کی مکمل تعلیم کی حمایت کی سن ۱۹۲۰ء میں دانیال ڈیفو (Daniel

De   f   e   ) نے اپنی کتاب 'تعلیم نسواں' میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کی سخت مذمت کی ہے اور اسے دنیا کا بدترین ظلم اور بربریت قرار دیا۔

تحریکِ نسواں کا بیج اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں بویا گیا۔ امریکہ اور انگلستان میں یہ پھلا پھولا اور دھیرے دھیرے یہ خیال جو عام تھا کہ عورت اور مرد کے میدان الگ الگ ہیں، ان کی خصوصیات بھی الگ ہیں۔ اس میں جسمانی طور پر مشکل کام کرنے اور سختیاں جھیلنے کی طاقت نہیں ہے۔ دور ہوا اور قانون اور سوشل Reality میں جو گہرا فرق پڑا کچھ کم ہونا شروع ہوا اور عورتوں کی سماجی حالت میں سدھار آنا شروع ہوا اور ان کو تعلیم ملنے لگی۔ یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۸۱ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے بھی عورتوں کا داخلہ منظور کرلیا۔ جاپان میں عورتوں کی الگ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں جو تحریکیں عورتوں کی سدھار کی چلیں، چاہے وہ مذہبوں کے تحت ہوں یا ویسے ہی ان سب کا مقصد گھر کے دائرے میں عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانا تھا اور خاندان میں اس کو عزت و وقار بخشنا تھا، ان تحریکوں کا اثر نمایاں طور پر شہری متوسط طبقے پر پڑا مگر عورتوں کی مجموعی طور پر حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جیسے برہمو سماج نے ۱۸۷۵ء میں عورتوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی وار اس کی قیادت راجہ رام موہن رائے نے کی۔ انھوں نے ستی کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کی مذمت کی۔ اس کو مذہب کے خلاف ٹھہرایا۔ اس تحریک کو ہندوستان گیر پیانے پر بڑھانے کا سہرا کیشپ چندسین کے سر ہے۔ جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم ہوئیں، اسکول کھلنے لگے۔ عورتوں کو گھر کی چاردیواری سے نکال کر باہر کی دنیا سے روشناس کرایا جانے لگا۔ سوامی دیانند کی قیادت میں علم کی ترویج کی منظم تحریک شروع ہوئی۔ تھوسوفیکل سوسائٹی نے مسز اینی بیسینٹ کی قیادت میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی ۱۹۰۴ء میں بنارس میں ہندو لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم وا۔ رام کرشن نے بھی عورتوں کی تعلیم میں اہم حصہ لیا۔ سوامی وویکانند کی قیادت میں اس مشن نے ہندوستان کی مذموم اور جہالت کی رسموں کے خلاف مہم چلائی۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے مدرسے قائم کیے۔ ان کے بھائی کرم چند نے گجرات میں لڑکیوں کے اسکول کھولنے کے لیے امداد دی۔

انیسویں صدی میں آزادئ نسواں کی تحریکوں میں زور پیدا ہوگیا۔ اب ان میں عورتیں بھی حصہ لینے لگیں۔ مہارانی تپسوینی، پنڈتا راما بائی، سورن کماری دیوی، رانی شرنومئی، رانا بائی ڈے وغیرہ مشہور خواتین نے تعلیم نسواں میں خاص دلچسپی لی اور اس تحریک کو آگے بڑھایا مگر یہ سب خواتین اعلیٰ طبقے کی تھیں۔ اس لیے ان کی یہ تحریکیں عوامی نہ بن سکیں اور ان کا دائرہ محدود رہا۔ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود عورتوں میں اپنی حالت کو بہتر بنانے کے جذبے کی کمی تھی۔ سینکڑوں سال سے اپنی کمتر حیثیت کا احساس ان کے ذہن نشین ہوگیا تھا۔ اس کو وہ خود بھی بدلنا نہیں چاہتی تھیں۔

جہاں تک مسلم معاشرے کا تعلق ہے اور خاص طور سے شمالی ہندوستان کا وہ اس سے الگ تھلگ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے مسلمانوں میں تجدد کی تحریک چلائی اور ان کو مغربی علوم اور انگریزی تہذیب کو اپنانے پر اکسایا اور مذہب کو عقل اور سائنس کی روشنی میں سمجھنے کی ترغیب دی۔ اس میں انھوں نے عورتوں کو بالکل الگ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس قوم کے مرد ہی جاہل ہیں وہاں عورتوں کی تعلیم کا سوال اٹھانے کا کون سا موقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں الگ اس لیے رہے کہ وہ خائف تھے کہ اس سے ان کی تحریک کو نقصان نہ پہنچے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے مخالف تھے۔ اس کا ثبوت ان کا وہ جواب ہے جو انھوں نے گرداس پور میں (جہاں وہ اپنے کالج کے لیے چندہ جمع کرنے گئے تھے) وہاں کی خواتین کو ان کے سپاس نامے کے اس حصے کے جواب میں دیا تھا جس میں انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں ان کی توجہ کا مطالبہ کیا تھا:

''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہوگئی اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو...... تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔''[!]

اسی موقع پر وہ اس بات کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ ''عورتوں کی تعلیم کی نسبت

! سفر نامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس بمقام گرداس پور، ۲۸ جنوری ۱۸۸۸ء ص ۱۰۳

میرے وہی خیالات ہے جو قدیم بزرگوں کے ہیں، پس جو علوم اس زمانے میں مفید تھے وہ صرف دینیات اور اخلاق کے تھے۔''[1]

یہی نہیں، سرسید آزادی نسواں کے اس قدر خلاف تھے کہ ۱۸۹۸ء میں مولوی ممتاز علی نے حقوق نسواں کے موضوع پر ایک کتاب لکھی اور اس میں انھوں نے عورت کی تعلیم اور آزادی کی حمایت کی تھی اور اس سلسلے میں لوگوں کو جو اندیشے تھے انھیں دور کیا تھا۔ ایک ملاقات میں مولوی صاحب نے یہ مسودہ سرسید کو دکھایا تو سرسید اس قدر خفا ہوئے کہ انھوں نے اس مسودہ کو اٹھا کر پھینک دیا۔ عبدالحلیم شرر کا کہنا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے ذکر پر خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ بعد میں یہ بھی کہنے لگے تھے کہ جب مرد پڑھ جائیں گے تو وہ آپ ہی عورتوں کی تعلیم کا انتظام کر لیں گے۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے ۱۸۹۱ء میں عورتوں کی تعلیم کی کوشش کو لازمی قرار دیا اور خواجہ الثقلین نے جو اس زمانے میں بی اے میں پڑھتے تھے اس تحریک کی حمایت میں پرزور تقریر کی۔ جس پر سرسید نے بہت خوشی کا اظہار کیا مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ عورتوں کی تعلیم تو ہو مگر کیسی اور کس طرح؟ یہ سوال غور طلب ہے۔ مگر عام طور سرسید کی اس مخالفت کو دبایا جاتا ہے اور اس کے طرح طرح کے جواز دیے جاتے ہیں اور برابر اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے مخالف نہیں تھے۔ اور اس قسم کی دلیلیں دی جاتیں ہیں: ''سرسید کو عظمتِ نسواں کا احساس بچپن سے ہو گیا تھا۔ 'سیرت فریدیہ' میں جہاں انھوں نے اپنی والدہ کا ذکر کیا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید پر ان کی والدہ کے حسنِ کردار کا کیا اثر ہے۔ لڑکیوں کی تربیت کے سلسلے میں ان کے خیالات اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی اور اسے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے اس کی طرف مردوں کی توجہ دلائی کہ وہ عورتوں کے حقوق کو پہچانیں۔''[2]

اپنی مذہبی اصلاح کے سلسلے میں سرسید نے عورتو کے مذہبی حقوق کے مسئلے پر ضرور لکھا

---

[1] سفر نامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس بمقام گرداس پور، ۲۸ جنوری ۱۸۸۸ء ص ۱۰۳

[2] ''علی گڑھ تحریک اور خواتین'' ڈاکٹر اصغر عباس 'اردو ادب کو خواتین کی دین' اردو اکیڈمی صفحہ ۱۷۱

ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ سرسید مردوں کو اپنی تحریک کے ذریعہ جدید علوم کے حصول کی ترغیب دے رہے تھے ان کو وقت کے تقاضوں سے روشناس کرا رہے تھے مگر عورتوں کے لیے وہ اسی طریقۂ تربیت اور تعلیم کو مستحسن قرار دیتے ہیں جو ان کی والدہ کی نسل کی عورتوں کے لیے رائج تھا۔ والدہ کی سیرت سے متأثر ہونا یا ان کی تعریف و توصیف حامیٔ نسواں ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے بھی اپنی والدہ مرحومہ کے مرثیہ میں ان سے اظہارِ عقیدت کیا ہے مگر وہ حامیٔ نسواں تو نہیں ہیں، وہ تو کہتے ہیں۔

شیخ صاحب خود بھی پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

یا

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈلی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین[1]
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ان کا خیال ہے کے آزادیٔ نسواں کا یہ چرچا بے کار ہے۔ چند سر پھروں کا سودا ہے۔ ورنہ عورت سے اگر پوچھا جائے گا تو وہ آزادیٔ نسواں کے مقابلے میں زمرد کے گلوبند کو ترجیح دے گی۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

سرسید جب انگلستان گئے اور تعلیم یافتہ سلیقہ مند گزرا لیڈروں سے ملے تو انھوں نے ان کو بہت سراہا۔ وہ لڑکیوں کے کالج و اسکول دیکھ کر کہتے ہیں: ''ایسے مدرسے، اگر ہندوستان میں ہوں تو میں ہر اشراف خاندان سے کہوں گا کہ بے شک اپنی لڑکی کو بھیجو۔''[2]

مگر سوال تو یہ تھا کہ یہ مدرسے کیسے ہوں گے جب ان کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی

---

1. ان اشعار کو اکبرالہ آبادی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔
2. 'علی گڑھ تحریک اور خواتین'' ڈاکٹر اصغر عباس 'اردو ادب کو خواتین کی دین' اردو اکیڈمی صفحہ ۲۷

جائے گی؟

لندن میں سر سید اپنے مالک مکان کی میڈ سے مرعوب ہیں کہ وہ اخبار پڑھتی ہے۔ مضمون لکھتی ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آپ یقین جانئے، اگر چہ یہ عورت (این اسمتھ) جو نہایت غریب اور نوکری کی محتاج ہے اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے اگر ہندوستان جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔ یہ نتیجہ صرف عام تعلیم و تربیت کا ہے۔''[1]

وہ اسی طرح برابر وہاں کی عورتوں کی لیاقت، وسعت مطالعہ اور کارکردگی کی تعریفیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی مالکہ مکان کی چھوٹی بہن مس ایلن سے مرعوب ہیں کہ وہ مذہبی کتابیں پڑھ کر ان سے عالمانہ گفتگو کرتی ہے۔ ''بلا مبالغہ یہ ایک مثال ہے جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہے کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور جملہ تربیت اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو بڑا تعجب ہوتا ہے۔[2]

اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا ''یورپ اور امریکہ کی حالتِ معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضروری ہوں، ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں، ہندوستان میں یہ زمانہ سینکڑوں برس بعد آنے والا ہے۔''[3]

ایک خط میں مولوی ممتاز علی کو لکھتے ہیں ''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورت کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا ہے اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے لیے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفت درماں ہے۔ یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔''[4]

اصل میں سر سید اس معاملے میں شدید **confused** تھے۔ ان کے اور ہمعصروں

---

[1] سفرنامۂ لندن مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۹۶
[2] سفرنامۂ لندن مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۹۶
[3] تعلیم نسواں سر سید اور ان کا عہد۔ ثریا حسین۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۳۵۶۔۳۵۷
[4] تعلیم نسواں سر سید اور ان کا عہد۔ ثریا حسین۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۳۵۶۔۳۵۷

کے ذہن اس معاملے میں بالکل صاف تھے۔ مثلاً حالی جو عورت کی تعلیم کے شدید حامی تھے، انگریزی قوم کے مہذب ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ''وہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا دستور قدیم چلا آتا ہے۔ وہی لڑکیاں صاحبِ اولاد ہوئیں تو انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دینا شروع کیا۔ یہی تو بات ہے ان کی عورتوں میں کہ عورتیں مرد ایک سانچے میں ڈھلے ہیں...... بغیر ماں کی تعلیم کے کسی کو آدمیت نہیں آتی۔''[1] انھوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے: ''ساری قوم سے میری عرض ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور ان کو خدائے تعالیٰ نے جو جوہرِ قابل دیا ہے اس کو خاک میں نہ ملائیں۔''[2]

اپنے خاندان میں حالی نے اس کی عملی کوششیں بھی کیں۔ سرسید کے مقابلے میں نذیر احمد کا نظریہ تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں زیادہ نیچرل اور صحت مند ہے۔ ''ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو علم کی طرح ایک خاص رغبت ہے لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچیوں کی حالت کے مناسب نہیں ہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دلوں کو افسردگی اور ان کی طبیعتوں کو انقباض اور ان کے ذہنوں کو کند ہوتی ہے تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کو پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں۔ ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادت کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرائے میں کہ ان کا دل نہ گھبرائے مگر تمام کتب خانہ چھان مارا مگر ایسی کوئی کتاب کا پتہ نہ ملا تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا''[3]

نذیر احمد نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کو اپنی ناولوں کے ذریعے پیش کیا اور اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔

شبلی تو خیر خواتین کی تعلیم اور آزادی کا بہت ترقی پسند نظریہ رکھتے تھے۔ اس میں بہت کچھ دخل اپنے زمانے کی روشن خیال آزاد تعلیم یافتہ خواتین سے ان کی دلچسپی اور دوستی کو بھی ہے۔ مگر اس موضوع پر کھل کر اظہارِ خیال کرنے میں ان کی 'مولوی' کی امیج بگڑتی تھی اور مسلمانوں کی قیادت کا شوق مانع تھا۔ رہے اکبر الہ آبادی تو ان کا معاملہ بالکل صاف ہے جو بہت مشکل سے

---

[1] مجالس النساء، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، مارچ ۱۹۷۱ء ص ۲۵

[2] مجالس النساء، دیباچہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، مارچ ۱۹۷۱ء ص ۲۹

[3] مراۃ العروس دیباچہ مطبع رزاقی چوک لکھنؤ

زمانے کا رنگ دیکھ کر اس پر راضی ہو گئے تھے کہ عورت کو شوہر اور اطفال کے لیے تعلیم ملنی چاہیے۔
بلا شبہ بقول حالی سر سید ایک ایسے ہیرو تھے جن کا راگ صدیوں تک گایا جاتا رہے گا۔ ان کی تحریک نے مسلمانوں میں تجدد کی لہر دوڑا دی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کی تعلیم و آزادی کے سلسلے میں ان کے خیالات بہت دقیانوسی تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ نہ آزادی نسواں کا مسئلہ ان کے دل کے قریب تھا۔ یہ بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سے سر سید کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا اس لیے ہمیں حقائق کو مسخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود دنیا میں آزادی کی جو لہر تھی اس کا اثر تھا کہ ہندوستان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا خیال یہ تھا کہ عورت اور مرد کی تعلیم میں تقدیم اور تاخیر کیوں۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں میں مولوی سید ممتاز علی نے عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی حمایت کی۔ ان کی کتاب کا ذکر آچکا ہے۔ اس کتاب میں ان سب اعتراضوں کا جواب دیا جو لوگوں کو آزادیٔ نسواں پر لے جاتے تھے۔ انھوں نے ان اندیشوں کو بھی دور کیا جو لوگوں کو عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی عورتوں کے اس پردے کی مخالفت کی جو اسلامی پردے کے نام سے عورتوں میں رائج تھا۔ مسلمان عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے سلسلے میں بیگم بھوپال سلطان جہاں بیگم نے بھی بہت بڑا رول ادا کیا۔ انھوں نے بھوپال میں عورتوں کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے۔ دھیرے دھیرے عورتیں بھی اس میں شامل ہونے لگیں۔ **All India Ladies Conference** کے قیام سے بھی تعلیم نسواں کے فروغ میں کافی مدد ملی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی اور اس نے آزادی اور بیداری کی لہر پیدا کی۔ اس میں عورتوں کو بھی شامل کیا۔ ۱۸۸۶ء میں سر سید سے جب تعلیم نسواں کے موضوع پر بات ہوتی تھی تو وہ اس کی مخالفت کرتے تھے اور آخر میں یہ کہہ دیتے تے کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ عورتوں کی تعلیم کی فکر بھی کریں گے۔ ان کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی تھی۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ہی وہ گروپ تھا جس نے تحریکِ نسواں کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۸۸۶ء میں سر سید نے ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اسی میں ان کے کالج کے پڑھے ہوئے طالبِ علم تھے، انھوں نے اس کے ذریعہ بیداری نسواں کے مسئلے کو اٹھایا۔ خواجہ غلام الثقلین کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم اور سب سے زیادہ شیخ محمد عبداللہ نے عورتوں کی تعلیم کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔

جہاں تک انگریز حکومت کا اس مسئلے میں دلچسپی لینے کا سوال تھا وہ اس کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس لیے کہ سماج میں اس کی بہت مخالفت تھی اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جس سے ان کی حکومت کے استحکام میں فرق آئے۔ لیکن جب خود ہندوستانیوں کے ایک طبقے کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی تو حکومت نے بھی اس کی کسی نہ کسی حد تک حمایت شروع کردی۔ لارڈ ڈلہوزی نے عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے اور ان کی تعلیم کے فروغ کے لیے سب سے پہلے اقدام کیے۔ ۱۸۵۰ء میں انھوں نے اعلان کیا: ''گورنر جنرل درخواست کرتے ہیں کہ کاؤنسل آف ایجوکیشن کا مطلع کیا جائے۔ اب عورتوں کی تعلیم ی سرپرستی کو بھی وہ اپنے فرائض میں داخل سمجھے۔ جہاں کہیں بھی دیسی باشندوں میں لڑکیوں کے اسکول قائم کرنے کی خواہش نظر آئے وہاں اس کا فرض ہوگا کہ ان کی ہر ممکن ہمت افزائی کرے اور ان کے منصوبوں کو آگے بڑھانے میں اسی طرح مدد کرے۔ اسکولوں کی کارکردگی کا معیار گرنے نہ پائے۔''[1]

سرسید کی زندگی ہی میں ایجوکیشنل کانفرنس میں عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک الگ شعبہ کھلا۔ اس کانفرنس کے ذریعہ خواجہ غلام الثقلین، شیخ عبداللہ، مولوی سید امتیاز علی اور سید کرامت حسین نے تعلیم نسواں اور حقوقِ نسواں پر لیکچر دیے۔ نذر سجاد حیدر جو اس زمانے میں بنت نذر الباقر تھیں۔ مولانا آزاد کی بہن آبرو بیگم، سلطان بیگم (مولوی ذکاءاللہ کی بہو) والدہ افضل علی، نذر سجاد حیدر کی پھوپھی اکبری بیگم، زاہدہ شیروانیہ بیگم شیخ عبداللہ (وحیدہ بیگم) محمدی بیگم (ممتاز علی کی بیوی مدیر تہذیب نسواں) گیتی آرا بیگم، نفیس دلہن وغیرہ نے اس کانفرنس سے عورتوں کی آزادی کے فروغ کا کام کیا۔ ان لوگوں میں شیخ عبداللہ اور کرامت حسین نے عورتوں کی تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ سید کرامت حسین نے اپنی زندگی کا پورا اثاثہ لکھنؤ گرلس کالج کو دے دیا۔ جو اب بھی کرامت حسین گرلز کالج کے نام سے مشہور ہے اور ہندوستانی خاص طور سے مسلمان لڑکیوں کی کئی نسلیں اس سے فیضیاب ہوئی ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں بیگم بھوپال کی سرپرستی میں علی گڑھ میں شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا اور ایک سال بعد گورنمنٹ کی امداد سے شہر سے باہر لڑکیوں کا بورڈنگ کھولا گیا جس کے ایک حصے میں کلاسز ہوتی تھیں جو بعد میں ترقی کرتے کرتے ویمن کالج بنا۔ اس میں شیخ عبداللہ کی بیوی وحیدہ بیگم ان کی دست راس تھیں۔ بقول ثریا حسین: ''شیخ عبداللہ نے اس زمانے کے سماجی دباؤ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے...... قوم کے عضو

---

[1] اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات، ڈاکٹر وحید کوثر، اعجاز پریس، حیدرآباد، ص ۱۸۳۔۱۸۴

معطل یعنی لڑکیوں کی تعلیم سے بہرور کیا...... وہ بلاشبہ برصغیر کے عورتوں کے مسیحا تھے۔"[1] جہاں تک انگریز حکومت کا تعلق تھا ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی اور اس کے قیام کے ساتھ ملک میں عام بیداری کا احساس پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ غلامی کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ مسز اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا ویمن کانفرنس منعقد کی جس کی وہ صدر منتخب ہوئیں اور انھوں نے کہا اگر ہندوستانی اپنی اور اپنے ملک کی نجات و بہبودی چاہتے ہیں تو انھیں عورتوں کی اصلاح کرنا چاہیے۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی کانگریس میں شمولیت کے بعد عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی لہر تیز ہوئی۔ انھوں نے اس تحریک میں عورتوں کو شامل کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کراچی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا تو اس میں عورتوں کو دستوری حقوق دینے کا اعلان ہوا۔ گاندھی جی نے جنگ آزادی میں عورتوں کے رول کا اعتراف کیا۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو یورپین عورتوں کے سامنے بطور مثال پیش کیا۔ "میں یورپ کی عورتوں سے کہہ رہا ہوں کہ انہیں ہندوستانی عورتوں کی پیروی کرنا چاہیے جو پچھلے سال ایک دم عوامی تحریک کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر یورپ کی عورتیں عدم تشدد سے سبق لیں تو انھیں اطمینان اور سکون حاصل ہوسکتا ہے۔"[2]

اردو رسالوں نے بھی عورتوں کی بیداری میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کے لیے فضا ہموار کی۔ عورتوں کو خود لکھنے اور اپنے مسائل پر اظہار رائے کی دعوت دی اور عورتوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جس نے آگے چل کر ادب میں تصانیف کیں۔ تصانیف میں حصہ لیا اور سماجی خدمات انجام دیں۔ ان رسالوں میں تہذیب نسواں لاہور ۱۸۹۸ء، عصمت دہلی ۱۹۰۸ء، خاتون ۱۹۰۴ء، ظل سلطان، شریف بی بی لاہور، الحجاب آگرہ ۱۹۰۹ء، سہیلی ۱۹۱۵ء، استانی ۱۹۰۴ء، النساء حیدر آباد ۱۹۱۹ء، نور جہاں ۱۹۲۶ء امرتسر۔ مگر سب سے زیادہ اس تحریک کو تقویت اردو ناول نے پہنچائی۔ ناول کی ابتدا ہی سے اس کا خاص موضوع عورتیں اور سماج میں ان کی حیثیت تھی اور اردو ناول کے ابتدائی دور کے بعد سے ہی عورتوں نے ناول لکھنے شروع کیے اور قصوں کی صورت میں عورتوں کے مسائل کو پیش کیا اور اس کے ذریعہ سماجی حیثیت متعین ہوئی۔ وقت کے ساتھ عورت کا سماج میں کیا مقام ہو، یہ متعین ہوتا گیا۔

---

۱ "تحریک نسواں اور اردو ادب۔' اردو ادب کو خواتین کی دین' اردو اکیڈمی صفحہ ۱۶۲

۲ "تحریک نسواں اور اردو ادب۔' اردو ادب کو خواتین کی دین' اردو اکیڈمی صفحہ ۱۵۲

پانچواں باب

اردو ناول میں
عورت کی سماجی حیثیت

- ☆ تعلیم
- ☆ پردہ
- ☆ بیوہ کے مسائل
- ☆ طوائف کا مسئلہ
- ☆ تعدد ازدواج، بغیر مرضی کی اور بے جوڑ شادی، طلاق، خلع
- ☆ خلاصۂ بحث

پانچواں باب

اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت

ابتداء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اگر ہم اردو ناول کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اردو ناول کا خاص موضوع عورت کی سماجی حیثیت ہے اور اس سے متعلق مسائل کو شروع سے ہی ناولوں میں بیان کیا گیا ہے۔ نذیر احمد کی پہلی ناول 'مراۃ العروس' کا مقصد ہی عورتوں کی تعلیم کے مواد کو فراہم کرنا تھا۔ اس ناول میں انھوں نے خاندان میں عورت کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اچھی تعلیم اور تربیت یافتہ خاندان کی لڑکی اپنے چاروں طرف کے ماحول کے لیے کس حد تک فائدہ مند ہوتی ہے اور اس کے برعکس جاہل، پھوہڑ، بری تربیت کی لڑکی کس طرح زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی دوسری ناول 'بنات النعش' میں گھریلو مکتب کے ذریعہ لڑکیوں کی تعلیم کا نقشہ پیش کیا ہے۔ 'توبۃ النصوح' اور 'ابن الوقت' میں براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر عورتوں کی جہالت اور بری تربیت کے نقصانات دکھائے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ بری تربیت لڑکی اور لڑکے دونوں کو خراب کر دیتی ہے۔ اس کے بعد کے دو ناول فسانہ مبتلا یا محصنات اور ایامٰی میں خاص عورتوں کے مسائل ہیں۔ ایک میں انھوں نے بیوہ کی شادی کی حمایت کی ہے۔ دوسری میں طوائف کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ ساتھ میں ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت کی ہے۔

عبدالحلیم شرر نے زیادہ تاریخی ناول لکھے ہیں، اور ان میں عورتوں کے فعال کردار ہیں۔ جو بہادر ہیں، جنگجو ہیں اور مردانہ وار مردوں کے ساتھ جنگ کے میدانوں میں یا دوسری مہموں میں شریک ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو معاشرتی ناول لکھے ہیں ان میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا۔ پردہ کی مخالفت، بغیر دیکھے شادی کے نقصانات، بغیر مرضی کے شادی وغیرہ کی مخالفت کی ہے۔

سرشار نے بھی اپنی ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی ہے۔ عورتوں کی آزادی اور ملک میں چلنے والی تحریکِ نسواں کا بڑھ چڑھ کر خیر مقدم کیا ہے۔

اس کے بعد ناول نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے عورت کے اسٹیٹس کو ہندوستان کی سماجی حالت کے تناظر میں اپنے اپنے انداز میں خاص اہمیت دی۔ عورتوں کی بڑی تعداد نے ناول نگاری شروع کی اور خود اپنے لیے تعلیم اور آزادی کی مانگ کی اور اپنی اپنی طرح ناولوں میں اس بات کو پیش کیا کہ عورتوں کے ساتھ سماج میں جو ناانصافی اور ظلم ہو رہے ہیں ان کے خلاف خود عورتوں کو آواز اٹھانا چاہیے۔ بعض خواتین نے گھر کے اندر ہی رہ کر عورت کی تعلیم کی حمایت کی اور اس کے رول کو گھر کی چاردیواری تک ہی محدود رکھا۔ بعض نے اس کے باہر آنے کی حمایت کی۔ مشرقی روایات اور اسلامی پردے کے ساتھ مخلوط تعلیم پر بھی زور دیا، اور یہ کہا کہ مسلمان عورتیں پردے کے ساتھ باہر رہ کر اپنا باہر کا کام بھی کر سکتی ہیں۔ آگے چل کر ان کی اسکول و کالج کی تعلیم کھلے بندوں سیاست میں حصہ لیتے بھی عورتوں کو دکھایا گیا ہے۔

مرزا رسوا، قاضی سجاد حسین اور قاضی سرفراز حسین نے طوائف کی زندگی کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا اور یہ دکھایا کہ عورت خود طوائف نہیں بنتی بلکہ اس کو سماج طوائف بناتا ہے اور پھر اس سے نفرت کرتا ہے۔

اس کے بعد کے ناول نگاروں نے بھی عورتوں کی سماجی حیثیت کو کسی نہ کسی طرح اپنا موضوع بنایا۔ ان میں سب سے اہم نام راشد الخیری کا ہے جنھوں نے سماج کی دبی کچلی عورتوں اور مصیبت زدہ عورتوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو دردناک انداز میں بیان کیا۔ محمد طبیب، مرزا محمد سعید، بشیر الدین، سید احمد دہلوی نے بھی عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔

جب یہ ناول لکھے جا رہے تھے اس وقت ہندوستان کا ایک چھوٹا سا طبقہ مغربی تہذیب بلکہ انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید میں ترقی اور آزادی کے غلط تصور میں غلط راہ پر جا رہا تھا۔ مغرب زدہ خواتین تعلیم اور آزادی کا یہ مطلب سمجھتی تھیں کہ وہ بچوں اور گھر سے بیگانہ ہو کر کلبوں میں ناچیں اور پارٹیوں میں بے حجابانہ شرکت کریں۔ اس لیے بہت سے ناول نگاروں نے ان عورتوں کی زندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ

بات صاف ہو سکے کہ ان کا مطلب اس آزادیٔ نسواں سے نہیں ہے اور وہ اس کو سخت مضر جانتے ہیں۔ انھوں نے اس کی مخالفت اس لیے بھی کی کہ اس طرح کی طرزِ زندگی اور رویوں سے آزادی نسواں کو نقصان پہنچ رہا تھا اور لوگ یہ سب دیکھ دیکھ کر عورتوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنا چاہتے تھے۔ سرشار کے بعد کے ناول نگاروں کے یہاں یہ موضوع اکثر ملتا ہے۔

اس کے بعد ناول نگاری کے میدان میں پریم چند آئے جنھوں نے ہندوستان کی عام عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی ناولوں میں لیا۔ ان کی ناول نگاری کی ابتداء 'بیوہ' سے ہوئی جس میں انھوں نے ہندو بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ طوائف کا مسئلہ، بے جوڑ شادی، بے مرضی کی شادی کی انھوں نے سخت مخالفت کی۔ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی بھی جس کا ان کے دور کے آنے تک کافی حد تک تصور بدل چکا تھا، حمایت کی۔ انھوں نے عورت کو میدانِ سیاست میں بھی مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ پریم چند کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک کی ابتداء ہوئی اور اس کے تحت عورتوں کے مساویانہ حقوق پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس کے بعد کے ناولوں میں عورت کو اعلیٰ تعلیم یافتہ، برسر روزگار اور جدوجہد آزدای میں اس کو کامریڈ کا درجہ ملا اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی رہا اور اب بھی جاری ہے۔ یہ تو ایک مجموعی تصویر ہے مگر ہم الگ الگ ان مسئلوں کو جو عورت کی سماجی حالت کو بہتر بنانے میں معاون ہوئے اور اردو ناول نگاروں نے ان کو اپنی ناولوں میں کس طرح پیش کیا اور وقت کے ساتھ اس کا تصور کس طرح بدلتا رہا۔ ساتھ میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگی کہ بعض ناولوں میں وقت سے پہلے ابتداً ہی میں عورت کی آزادی اور تعلیم کے بہت ترقی پسند نظریات پیش کیے گئے اور یہ بھی کہ ان ترقی پسند رویوں کی رد میں بہت سے ناول لکھے گئے جن کا مقصد آزادیٔ نسواں کے اس طوفان کو روکنا تھا جو تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا اور وہ ہندوستانی سماج کے ایک طبقے کے لیے بہت نقصان دہ تھا۔

۱۔ سب سے پہلا اور اہم مسئلہ عورتوں کی تعلیم

۲۔ دوسرا ان کو مرد سے کمتر نہ سمجھنا

۳۔ پردہ

۴۔ بغیر مرضی کی شادی اور بے جوڑ شادی

۵۔ عورتوں کی مغربی تہذیب کی تقلید کے نقصانات

۶۔ بیوہ کی دوسری شادی

۷۔ ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت

۸۔ گھر کی چہار دیواری سے باہر عورت کا کوئی رول ہے یا نہیں

۹۔ عورت کے آزاد وجود کا تھوڑا سا احساس

(الف) تعلیم

نذیر احمد کی پہلی ناول 'مراۃ العروس' لڑکیوں کے تعلیم کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کے دیباچے میں نذیر احمد کہتے ہیں۔ ''ہر چند اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں ہے پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف گھرانوں کی اکر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو رسالے پڑھ لیا کرتی ہیں۔ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچیوں کی حالت کے لیے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں ان سے دلوں کو افسردگی ان کی طبیعتوں کو انقباض ان کے ذہنوں کو کند ہوتی ہے تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہو اور ان کے معاملات میں جو عورتوں کو زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات، جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور دلچسپ پیرائے میں جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے، مگر تمام کتب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا۔''[1]

قصے کی تمہید کے آخر میں لکھتے ہیں:

''غرض یہ ہے کہ کل خانہ داری کی درستی عقل پر ہے، اور عقل کی درستی علم پر موقوف ہے۔''[2]

اس تمہید کے ساتھ انھوں نے مراۃ العروس میں دو لڑکیوں کا قصہ اس حقیقت پسندانہ اور دلچسپ انداز میں لکھا کہ وہ عورتوں کے حلقے میں بہت پسند کیا گیا۔ اس میں نذیر احمد نے ایک ہی خاندان کی دو لڑکیوں اصغری اور اکبری کی زندگی کو سیدھے سادے انداز میں دہلی کے ایک متوسط گھرانے کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اصغری گھر کی پڑھی لکھی تربیت یافتہ سمجھ دار لڑکی ہے جو میکے اور سسرال دونوں کو اپنی سمجھداری اور سلیقے سے جنت بنا دیتی ہے

---

[1] دیباچہ مراۃ العروس مطبع رزاقی چوک لکھنؤ

[2] دیباچہ مراۃ العروس مطبع رزاقی چوک لکھنؤ، ص ۱۴۲

اور دوسری جہنم ۔ اکبری کے کردار میں نذیر احمد نے غیر تعلیم یافتہ ، بے تربیت ، مسلمان متوسط گھرانے کی عورت کی تصویر پیش کی ہے اور یہ ثابت کیا کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے عورتوں میں کس قسم کی توہم پرستی اور بے عقیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اکبری اپنے مسائل کا حل خود اپنی سمجھ اور عقل کے بجائے ٹونے ٹوٹکوں سے نکالنا چاہتی تھی اور گنڈے تعویز کرواتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ اس کے میاں کا کردار انھوں نے بہت اچھا دکھایا ہے اور بالواسطہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ جس طرح برے شوہروں سے عورتیں نباہ کرتی ہیں مردوں کو بھی بری بیویوں سے نباہ کرنا چاہیے۔

اصغری کا تعارف نذیر احمد یوں کرواتے ہیں۔ ''اصغری خانم بہت عقلمند اور فہمیدہ نیک مزاج تھی۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے قرآن شریف کا ترجمہ اور مسائل کی اردو کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ لکھنے میں بھی عاجز نہ تھی۔ گھر کا حال اپنے ماں باپ کو ہفتے ہفتے لکھ کر بھیجا کرتی تھی۔''[1]

اس لیے اپنے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کو مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ مثلاً چالاک ماما کسی اشتہار کو لاکر گھر پر لگا دیتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ بنیا جس کا یہ خاندان مقروض ہے۔ اس نے نالش کردی ہے۔ اصغری اس اشتہار کو پڑھ کر اس کا سارا بھانڈا پھوڑ دیتی ہے۔ اپنے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے وہ گھر کے مردوں کے بغیر مسائل کو سلجھا لیتی ہے۔ میاں کو نئے زمانے کے علم سیکھنے پر اکساتی ہے۔ تعلیم کی طرف راغب کرتی ہے۔ خود گھر میں مکتب کھولتی ہے، اور محلے کی لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی وہ گھر میں لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ اس میں نذیر احمد گھریلو مکتبوں کے طریقہ تعلیم اور اس کی استانیوں پر بھی تنقید کی ہے کہ وہ کس طرح لڑکیوں سے کام لیتی ہیں اور ان کی تعلیم پر توجہ کم کرتی ہیں۔ ''مکتبوں میں دن بھر کی قید، استانیوں کی سختی، پڑھنا کم، مار کھانا اور کام کرنا، دن بھر میں پڑھے تو صرف دو حرف صبح شام تو معمولی مار اور جہاں چپ کی اور استانی جی کی نظر پڑ گئی اور آفت آئی......''[2]

پھر وہ اصغری کے مکتب کے بارے میں کہتے ہیں:

---

[1] مراۃ العروس ص ۳۱

[2] مراۃ العروس ص ۱۵۲

''اصغری کے یہاں نہ مار نہ دھاڑ۔ بڑا ڈر یہ تھا کہ سنو بوا تم سبق نہیں یاد کرتیں۔ تمھارے سبب سے ہمارے مکتب کا نام بدنام ہوتا ہے۔ میں تمھاری اماں جان کو بلا کر کہہ دوں گی تمھاری لڑکی یہاں نہیں پڑھتی۔ اس کو تم کسی دوسری استانی کے پاس بٹھاؤ...... نہ یہاں جھاڑو دینی، نہ بچھونے نہ چارپائیاں ڈھونی ہیں نہ برتن مانجھے ہیں نہ خلیفاؤں[1] کو لادے لادے پھرنا بلکہ خود لڑکیوں پر ایک عورت نوکر تھی۔''[2]

اسی طرح نذیر احمد عورتوں کی تعلیم میں جدتیں پیدا کرنے کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں اور قرآن شریف، معمولی لکھنے پڑھنے، خانہ داری کے ساتھ وہ اصغری کے مکتب میں عورتوں کو حساب کتاب، جغرافیہ، تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کے بارے میں معلومات کی وکالت بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کو اس لیے ضروری قرار دیا ہے کہ تعلیم یافتہ مائیں ہی اولاد کو اچھی تربیت دے سکتی ہیں۔ کہتے ہیں۔''مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں میں نہیں سکھا سکتے اور ماؤں کی تعلیم میں ایک بڑا لطف یہ ہے کہ لڑکوں کی طبیعت کو وحشت نہیں ہونے پاتی ہے اور شوق کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔''[3]

بنات النعش میں نذیر احمد نے ایک مثالی مدرسے کا نقشہ پیش کیا ہے جو ان کے نزدیک اس زمانے میں عورتوں کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ اس مدرسے یا مکتب کو ان کے ناول مراۃ العروس کی ہیروئن اصغری چلاتی ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے آگے چل کر جو عورتوں کے اسکول کھولے گئے، اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں عورتوں کی تعلیم کو صرف قرآن اور مذہبی مسئلے مسائل تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ دوسرے علوم کو بھی ان میں شامل کیا ہے جیسے علم جرثقیل، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ۔ کشش اتصال، مقناطیس وغیرہ۔ انھوں نے انگریزی تہذیب کی اچھی باتوں کی وکالت کی ہے اور عورتوں کے پرانے نظام کو بدل کر نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ مگر وہ اس چیز کو ایک اشو بنا کر سماج کے سامنے پیش کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے کہ اس کی فضا نہایت مخالف تھی۔ خود انگریز حکومت بھی اس

---

[1] استانی کے بچے
[2] مراۃ العروس ص ۱۵۳
[3] مراۃ العروس ص ۲۶۔۲۷

مسئلے کو چھیڑتے ڈرتی تھی۔ اس لیے جب نذیر احمد اپنے لکچر میں یہ کہتے ہیں: ''بہت کروان کو اردو لکھنا پڑھنا سکھا دو یا بی اے، ایم اے کے درجے تک پڑھانا ہو تو حساب میں جمع تفریق ضرب تقسیم تو شریفوں کے گھر میں اتنی تعلیم سبقاً سبقاً اور سینہ بہ سینہ پردے کے ساتھ اب بھی ہو رہی ہے اس کے لیے اتنا غل غپاڑہ کیا ضروری ہے۔''[1]

تعلیمِ نسواں کے بارے میں ان خیالات سے یہ بات بالکل میل نہیں کھاتی۔ اس لیے یہ بات بالکل صاف ہے کہ انھوں نے زمانے کو دیکھ کر اس مسئلے کو قصے اور کہانی کے طور پر بیان کر کے زندگی کے روزمرہ کے واقعات کے پیرائے میں تعلیم نسواں کی ضرورت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو بلاشبہ مؤثر بھی ثابت ہوئی۔ جہاں تک ان دو ناولوں کا تعلق ہے ان کا موضوع سماج میں عورت کی اہمیت اور ان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنے دوسرے ناولوں میں بھی تعلیم نسواں کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ توبۃ النصوح کا ہیرو نصوح اپنی بیوی کو خود پڑھاتا ہے۔ ''ان ہی دنوں تعلیم نسواں کا چرچا شروع ہوا تھا۔ نئی نئی کتابیں جو عورتوں کے لیے جاری ہوئی تھیں، نصوح نے سب کو شوق سے دیکھا۔ اس کا دل اس بات کو مان گیا تھا کہ عورتوں کو پڑھانے لکھانے میں چند در چند فوائد دینی مضمر ہیں چنانچہ اس نے بعض مقامات دلچسپ بی بی کو پڑھ کر سنائے۔ بھلائی کی بات سبھی کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بی بی نے اس کو تسلیم کیا کہ عورتوں کے لیے پڑھنا بہت مفید ہے۔ بال بچوں کا کچھ بکھیڑا نہ تھا۔ میاں نے پڑھانا شروع کیا تو چار پانچ مہینے میں اردو پڑھنے لکھنے لگی۔''[2]

اسی طرح 'ایامیٰ' انھوں نے میری کے کردار میں عورت کی اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی اور اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں شادی کی اہمیت کو کم کر کے دکھایا ہے اور اس کردار کو ایک مثبت کردار بنا کر پیش کیا ہے۔

اسی زمانے میں مولانا الطاف حسین نے بھی عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر ایک ناول مجالس النساء لکھا اور اس میں تعلیم نسواں کے مسئلے کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اس ناول کی ہیروئین آتو جی[3] کی زبانی یہ بھی کہلوایا کہ ہندوستانیوں، خاص طور سے مسلمانوں نے لڑکیوں

---

[1] مجموعۂ لیکچرز جلد اول ص ۲۱۶

[2] توبۃ النصوح ص ۵۱-۵۲

[3] یعنی استانی

کو تعلیم سے محروم رکھا اور لڑکوں کو تھوڑا بہت تعلیم دلوانا اس لیے گوارا کیا کہ وہ ان کو کما کر کھلائیں گے۔ اس لیے لڑکیوں نے بھی تعلیم میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ انھوں نے حکمراں قوم کی ترقی کا سبب یہی بتایا کہ ''ان کے یہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔ وہی لڑکیاں جب بیاہی گئیں اور صاحبِ اولاد ہوئیں، انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دینا شروع کیا۔ یہی تو بات ہے ان کے مرد عورتیں ایک سانچے میں ڈھلے ہیں۔''[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''بغیر ماں کی تعلیم کے کسی کو آدمیت نہیں آ سکتی۔''[2] اسی طرح سرشار کے فسانۂ آزاد کی ہیروئین حسن آرا تعلیم یافتہ ہے، روشن خیال ہے، تعلیم نسواں کی شدید حامی اور اس کے فروغ میں کوشاں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتی ہے: ''میاں بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں گے تو خوب مزے سے کٹے۔''[3] اور آگے چل کر حسن آرا عورتوں کا مدرسہ کھولنا چاہتی ہے اور اس کے لیے وہ لیکچر لکھتی ہے اور آزاد سے کہتی ہے۔ ''ہماری دلی آرزو ہے کہ ہم یہاں مدرسۂ نسواں قائم کریں۔ یہاں ہندوؤں کی بستی زیادہ ہے۔ میں نے لیکچر لکھا ہے، میاں آزاد اگر اصلاح دے دیں تو میں کسی دن یہاں کے شریفوں کو جمع کر کے لیکچر دوں۔ شاید دل پر اثر کرے اور کوئی نتیجہ نکلے۔''[4] یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ حسن آرا کہتی ہے، ''یہاں ہندوؤں کی بستی زیادہ ہے۔'' اس لیے مسلم معاشرے میں تو مردوں کے لیے بھی جدید تعلیم معیوب تھی۔ اس لیے عورتوں کے لیے مدرسہ قائم کر کے ان کو نئی طرح کی تعلیم دینا ممکن نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں میں یہ وحشت کم تھی۔ اس لیے کہ ہندو معاشرے میں اصلاحی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور ان کا کچھ نہ کچھ اثر ہو رہا تھا لیکن جہاں تک سرشار کا تعلق ہے وہ دونوں طبقوں میں تعلیم کی اشاعت چاہتے ہیں اور اسلام اور ہندو دھرم دونوں کی رو سے تعلیم نسواں کو جائز ثابت کرتے ہیں۔ تعلیم نسواں ممنوع نہیں ہے۔ دھرم شاستر اور شرح محمدی دونوں کی رو سے اس کا جواز پیش کرتے ہیں: ''اگر شرح محمدی کی رو سے عورتوں کی تعلیم ناجائز ہوتی تو اہل اسلام کی وہ عورتیں جو مقدسہ سمجھی جاتی رہیں جو واقع میں اس لائق تھیں کہ ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کو دستور العمل بنائے، علم و فضل سے ضرور محروم رہتیں۔ ظاہر

---

[1] مجالس النساء۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۲۳

[2] مجالس النساء۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۲۳

[3] فسانہ آزاد، جلد اول، ص ۷۱

[4] فسانہ آزاد، جلد اول، ص ۵۱۰

ہے کہ علم کے بغیر شرح محمدی مرد ہو یا عورت بخوبی سمجھ نہیں سکتا اور جب تک نہ سمجھا گا ضرور ناقص العقل رہے گا۔ پس دین کو ترقی دینے کے لیے لازم آیا کہ ذکور ہی نہیں اناث بھی تعلیم پائیں۔ شرع کی رو سے جواز ظاہر ہے۔ میری ہندو بہنیں جانتی ہیں ہوں گی کہ جاگ دلک گھیسر کی استری تھیں۔ وہ علم و فضل میں آج تک مشہور ہیں۔ مہاراجہ دھرتراشت کی استری گندھاری جی اس قدر عالمہ متبحر تھیں کہ بیاس جیسے عالم اجل سے بحث ہوا کرتی تھی۔ لیلاوتی جی کے نام سے کون فرد بشر واقف نہیں۔ حساب میں ان کو اس قدر دستگاہ حاصل تھی کہ اچھے اچھے محاسب ان کو مانتے تھے۔ راجہ بھوج کے عہد میں ودیادھری جی مدارس نسواں کی معلّمہ مقرر تھیں۔ ایک اخبار میں میں نے پڑھا ہے، راجہ بھوج کی بٹی نے راجہ پرتھی راج کے نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر خط بھیجا تھا۔ اگر تعلیم نسواں کے خلاف احکام دھرم شاستر ہوتے تو ایسے اسے منی اور رشی اور مہاراجہ کب اس کو جائز رکھتے۔''[1]

سرشار نہ صرف مدرسۂ نسواں قائم کرتے ہیں بلکہ مس کلیرسا اور مس سٹیڈا کے ذریعے اصلاحِ نسواں کے کاموں کے ساتھ عورتوں کے زنانہ کالج قائم کرنے کی تجویز بھی رکھتے ہیں جس میں ہر طبقے کی عورتوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

شرر کے ناولوں میں بھی تعلیم نسواں کی حمایت کی گئی ہے۔ وہ تعلیم کو عورتوں کے لیے بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں تعلیم نسواں کا تصور خاصا ترقی پسند ہے۔ وہ عورت کی صرف گھریلو تعلیم کی وکالت نہیں کرتے بلکہ اس کی جدید تعلیم کے حامی ہیں۔ ان کے ناول 'حسن کے ڈاکو' کی ہیروئن مہ لقا کا تعارف وہ یوں کراتے ہیں۔ ''مکتب سے اٹھتے ہی ایک ہوشیار قابل لیڈی ڈاکٹر کے سپرد کر دی گئی۔ مس منٹن نے اسے اتنی انگریزی سکھادی کہ خوب اچھی طرح پڑھ لیتی ہے اور بولتی تو اس روانی اور خوبی کے ساتھ ہے کہ کالج کا کوئی لڑکا اس کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔''[2]

'طاہرہ' کی طاہرہ بیگم کو بھی ''میم صاحبہ نے عربی فارسی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھادی۔''[3] کیونکہ انگریزی تعلیم کی معاشرے میں سخت مخالفت تھی اس لیے اس ناول میں

---

[1] فسانۂ آزاد، حصہ اول، ص ۵۱۳

[2] حسن کا ڈاکو (حصہ اول) دلگداز پریس، لکھنؤ، ص ۲۴

[3] طاہرہ۔ شاہی پریس لکھنؤ، ص ۲۴

شرر نے دکھایا ہے کہ طاہرہ انگریزی پڑھی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا منگیتر جو بہت مذہبی ہے اس سے شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ فرنگی محل کے علماء بھی اس حق میں ہیں کہ انگریزی پڑھی ہوئی لڑکی سے شادی جائز نہیں ہے۔ اس لیے ولی اللہ مصر و عرب چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر اسے علماء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی پڑھی مسلمان لڑکی ہی سے نہیں بلکہ اہل کتاب سے بھی مسلمانوں کی شادی جائز ہے۔

شرر عورتوں کے لیے انگریزی یا جدید تعلیم اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کو مہذب سوسائٹی کے آداب آئیں گے۔ وہ معاشرے میں پھیلے اس تعصب کو دور کرنا چاہتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے سے انسان بے دین ہو جاتا ہے۔ ''کسی کی زبان بولنے سے کوئی کسی کے دین سے نہیں جاتا۔ عرب شام روم و ایران میں مسلمان عیسائیوں سے میل جول رکھتے ہیں، ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔''[1] نذیر احمد سرشار اور شرر کے بعد جو ناول نگار آئے ان سب نے عورتوں کو تعلیم کو اپنا موضوع بنایا۔ ان میں خواتین کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ ایسی خاتون رشیدۃ النساء ہیں جنھوں نے مولوی نذیر احمد سے متاثر ہو کر اپنا ناول اصلاح النساء ۱۸۸۱ء میں لکھا لیکن وہ شائع ۱۸۹۴ء میں ہوا۔ دیباچہ میں لکھتی ہیں: ''اللہ مولوی نذیر احمد کو عاقبت میں بڑا انعام دے۔ ان کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ جہاں ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا۔ اب ہم جو جانتے ہیں انشاء اللہ اس کو لکھیں گے۔''[2]

اس ناول میں دو کردار دکھائے گئے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ پڑھی لکھی سلیقہ شعار ذہین لڑکی کا ہے اور دوسرا پھوہڑ، جاہل، بے وقوف لڑکی کا۔ اس ناول میں رشیدۃ النساء نے تعلیم نسواں کی سخت حمایت کی ہے۔ اس میں وہ صاف صاف اپنے کردار کے منہ سے یہ کہلاتی ہیں کہ عورتوں کے ناقص العقل ہونے کا تصور تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ وہ بھی اب تعلیم پا کر علوم و فنون سے لیس ہو کر مردوں کے ہم پلہ ہو جائیں گی۔ وہ اس بات کی توجیہ بھی اس ناول میں کرتی ہیں کہ اگر عورتوں کی صلاحیتیں مردوں کے مقابلے کم نظر آتی ہیں تو اس لیے کہ عورتوں کو تعلیم نہیں ملتی ہے۔ مردوں کی تعلیم ہوتی ہے تو ان کے جوہر کھلتے ہیں اور عورتوں کے دب جاتے ہیں۔ عورتوں کی توہم پرستی، رسم پرستی، جلن، حسد، بزدلی یہ سب تعلیم کی کمی

---

[1] طاہرہ، ص ۱۳

[2] دیباچہ اصلاح النساء فوٹو اسٹیٹ کاپی خدا بخش لائبریری

کے باعث ہیں۔ اس لیے ان کو اس سے بچانے کا واحد طریقہ تعلیم ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ علم دین اور دنیا دونوں سے قریب کرتا ہے۔

عظیم آباد کے ہی شاد عظیم آبادی نے ۱۸۷۶ء میں جو ناول صورت الخیال لکھی اس کا موضوع بھی عورت کی تعلیم ہے۔ اس میں انھوں نے ایک تعلیم یافتہ عورت ولایتی کا کردار پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے تعلیم کی بدولت کس طرح کی مصیبتوں کا سامنا کیا اور اپنی سوجھ بوجھ سے اپنے شوہر کو سدھارا اور ہر مصیبت کا سامنا کیا۔

سید احمد دہلوی کی دونوں ناولوں 'راحت زمانی کی مزیدار کہانی' اور 'قصہ مہر افروز' کا موضوع بھی تعلیم نسواں کی اہمیت ہے۔ انھوں نے ان دونوں ناولوں میں قصوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ زور اسی پر ہے کہ تعلیم یافتہ ماں ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکتی ہے اور قوم کی اصلاح کے لیے تعلیم نسواں کو عام کرنا ضروری ہے۔ راحت زمانی کی مزیدار کہانی میں ایک مولوی سے تقریر کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سید علی سجاد کی ناول 'نئی نویلی' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ لکھنؤ کی زوال آمادہ سوسائٹی میں عورتوں کی پستہ حالت کو دکھایا گیا ہے۔ ناول نگار کا خیال ہے کہ عورتوں کو تعلیم نہ دینا اور انھیں علم کی نعمتوں سے محروم رکھنا بہت بڑی خود غرضی اور ناانصافی ہے۔ عورتوں کی تعلیم نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے لیے بھی مفید ہے۔

صفیر بلگرامی کی ناول 'جوہر مقالات' کی ہیروئین اشرف النساء ایک پڑھی لکھی عورت ہے جو اپنی تعلیم کی وجہ سے نہ صرف گھر کی حالت کو بہتر بناتی ہے، بچوں کی اچھی تربیت کرتی ہے، باہر کے معاملات بھی اپنی سوجھ بوجھ سے سلجھاتی ہے۔

اسی طرح میر محمد علی کی ناول 'نئی روشنی' میں عورت کی تعلیم کی حمایت ہے اور اس پر زور ہے کہ عورتیں تعلیم حاصل کریں مگر مردوں سے علیحدہ ہو کر۔ اور ایسی تعلیم کی شدید مذمت کی ہے جس میں لڑکیاں بے پردہ ہو کر مردوں کے ساتھ گھومیں۔

'گوڈر کا لال' جو والدہ افضل علی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مصنفہ نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اکبری بیگم نے جب یہ ناول لکھا تھا تو مسلمان گھرانوں کی عورتوں کا لکھنا اور اپنا نام ظاہر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس ناول میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع

بنایا گیا ہے۔ اس میں مصنفہ نے اپنے ایک کردار ثریا جبیں سے صاف صاف کہلوایا ہے کہ اگر معاشرے میں عورتیں پیچھے ہیں تو اس لیے کہ "علم کا دروازہ ہم پر بند کر دیا گیا ہے...... ہنر کو ہمارے لیے معیوب سمجھا گیا۔ صرف آپ لوگوں کی عنایت و مہربانی ہماری زندگی کا ذریعہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم کو پردے سے آزاد کریں۔ نہیں نہیں پردہ ہماری صفت ہے۔ ہمیں دل سے عزیز ہے۔ مگر ہمارے حقوق ہم کو دو۔ خدا کی دی ہوئی آزادی سے ہمیں نہ روکو...... پردے ہی میں ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"[1] اس ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم نسواں کے موضوع پر جو مضامین شائع ہو رہے تھے وہ مسلمان گھرانوں میں پڑھے جا رہے تھے اور رفتہ رفتہ معاشرہ اس کا اثر قبول کر رہا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے شروع میں تعلیم نسواں کا تصور عام پر یہ پیش کیا جا رہا تھا کہ عورتوں کی تعلیم ضروری ہے۔ مگر ان کا رول گھر کے اندر محدود رہے اور وہ باہر کے کام بھی اندر گھر کی چاردیواری اور پردے میں رہ کر کریں۔ سرسید کے ایم او کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے تعلیم نسواں کی بہت حمایت کی۔ سجاد حیدر یلدرم نے تعلیم نسواں کے موضوع پر اپنے مضمون میں کہا تھا: "مرد پڑھ کر آزاد خیال اور روشن خیال ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے ایسی بیویوں کی ضرورت ہے جو پڑھی لکھی، خوش سلیقہ ہوں، روشن خیال ہوں۔ جبھی زندگی کی گاڑی ٹھیک طرح سے چل سکتی ہے۔" اس زمانے کی بیشتر ناولوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ بھائی اپنی بہنوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ عباسی بیگم کی 'زہرا بیگم' کا بھی یہی موضوع ہے۔ جس میں زہرہ کا بھائی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ اپنی بہن کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے اور انگریزی تعلیم دلواتا ہے۔ انگریز عورتوں سے وہ متأثر ہوتی ہے مگر ماں کی جہالت اور دقیانوسیت کی وجہ سے پڑھی لکھی زہرہ کی شادی ایک جاہل نواب سے ہوتی ہے۔ پہلے وہ بیوہ ہوتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے۔ ناول المیہ پر ختم ہوتا ہے مگر اس میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کو انگلستان بھی جانا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

'ماہ درخشاں' بیگم مرزا علی کا ناول ہے۔ جس کا پس منظر مصر ہے۔ اس کی ہیروئین پڑھی لکھی ہے۔ تبلیغ اسلام کرتی ہے۔ باپ کے ساتھ ان کے دفتری کام کرتی ہے۔

طیبہ بیگم خدیو جنگ کے دونوں ناولوں حشمت النساء اور انوری بیگم دونوں کا موضوع

---

[1] گوڈر کا لال نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ص ۱۴۸

تعلیم نسواں ہے۔ جس میں عورتوں کی تعلیم وہ بھی جدید تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔

انوری بیگم میں طیبہ بیگم لڑکے اور لڑکیوں کی مساوی تعلیم دلانے کی حمایت کرتی ہیں۔ انوری جو اس ناول کی ہیروئن ہے اس کا تعارف وہ یوں کراتی ہیں۔ ''علو خیال اور روشن دماغی میں بڑے بڑے انگلستان کے تعلیم یافتہ ان کے سامنے طفل مکتب تھے۔ انھوں نے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو خاص تربیت دی۔ ان کی لڑکیاں اکثر انگلستان کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر انگریزی لکھتی پڑھتی تھیں۔ اس کے علاوہ مشرقی السنہ عربی فارسی وغیرہ بھی جانتی تھیں۔'' [۲]

امینہ خاتون کی ضخیم ناول شوکت آرا (تین حصوں) کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ اس کی ہیروئن کلثوم اسکول کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ باپ کے ساتھ طرابلس کی جنگ میں شرکت کرتی ہے۔ تبلیغ اسلام کرتی ہے۔ طاہرہ بیگم کی ناول 'فسانۂ نادر جہاں' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ جس میں طاہرہ بیگم کو ایک استانی رکھ کر تعلیم دی جاتی ہے اور وہ ایک مثالی خاتون ثابت ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ وہ تعلیم نسواں کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں۔ ''جو کچھ ہے وہ علم ہے۔ علم خدا سے ملائے، علم شیطان سے بچائے، علم شمشیر عقل کا صیقل ہے، علم انسان کے لیے جوہر اوّل ...... میری پیاری بہنو علم سیکھو، علم سکھاؤ۔ وقت جاتا ہے جلد ہوش میں آؤ۔ [۱]

'صغرا' ہمایوں مرزا کا مشیر نسواں ۱۹۰۲ء کا بھی خاص موضوع تعلیم ہے۔ جس میں نہ صرف اس ناول کی ہیروئین زہرا تعلیم نسواں پر لیکچر دیتی ہے اور اس کی اشاعت میں حصہ لیتی ہے اور اپنے لیکچروں میں عورتوں کے لیے نصاب بھی طے کرتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ عورتیں پردے کے اندر رہ کر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ پردہ کسی طرح ان کی تعلیم میں حارج نہیں ہے۔

نذر سجاد حیدر کی ناول 'اختر النساء' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ جس میں اختر النساء اسکول میں تعلیم حاصل کرتی ہے مگر سوتیلی ماں کے ظلم کی وجہ سے وہ اس کو مکمل نہیں کر پاتی۔ پھر بیوہ ہو کر تعلیم حاصل کرتی ہے اور نوکری بھی کرتی ہے۔ وہ ناول اس نوٹ پر ختم کرتی ہیں: ''ناظرین! یہ ہے تعلیم نسواں کا نتیجہ۔ اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں۔ کیسی

---

[۱] انوری بیگم، سن اشاعت تعداد ص ۵

[۲] افسانۂ عجائب، رام کمار بک ڈپو۔ ۱۹۱۷ء، ص ۱۶۸

کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔ کس بے بسی، کس محنت اور کوشش سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس سے خود فائدہ ہی نہیں اٹھایا۔ معزز سرکاری ملازمت ترک کر کے قومی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور نہایت قدر و منزلت کی حالت میں عمر بیوگی میں بسر کی۔''[1]

اختر النساء نے سرکاری نوکری ترک کیوں کی۔ اس کی وجہ مصنفہ بتاتی ہیں کہ، بیوگی کے بعد گو اختر کا ٹھکانہ باپ کے گھر نہ رہا تھا۔ لیکن وہ تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی زندگی اب بھی اچھی طرح گزر سکتی تھی۔ کچھ نہیں تو اسکول ہی میں کام کر کے یا فراغت سے بسر اوقات کر سکتی تھی۔ مگر اس خیال سے اس قدر مصیبتیں اس نے اپنے سر لیں کہ تعلیم کے مخالف یہ نہ کہیں کہ دیکھو تعلیم کا اثر۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا۔ اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا۔''[2]

اور بھی خواتین نے بڑی تعداد میں اس موضوع پر ناول لکھے۔ ایک بات قابلِ لحاظ ہے کہ ایسے ناولوں کی بھی بڑی تعداد ہے جس میں غلط جدید تعلیم کے برے نتائج کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ مردوں کا ایک طبقہ انگریزی تہذیب کی اندھادھند تقلید میں خود کو 'مہذب' بنانے کی خاطر اپنی تہذیب، مذہب اور روایات سے کٹ گیا تھا اور وہ عورتوں کی اس قسم کی تعلیم کی حمایت کر رہا تھا جسے حاصل کر کے عورتیں ان انگریز عورتوں کی نقالی میں اپنے فرائض کو بھلا بیٹھی تھیں اور اس کو دیکھ کر لوگ تعلیم نسواں کے خلاف ہو رہے تھے۔ اس لیے انیسویں صدی کے شروع میں ایسے بہت سے ناول ہیں جن کا موضوع عورتوں کی غلط تعلیم ہے اور جس میں مغرب کی اندھادھند تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ جن میں توازن پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ تعلیم نسواں کا یہ تصور غلط اور سماج کے لیے تباہ کن ہے۔ نذر سجاد حیدر کی 'نجمہ' اور 'روشنک بیگم' کا بھی یہی موضوع ہے۔

اپنی ناول 'نجمہ' ۱۹۴۲ء میں وہ یہ کہتی ہیں کہ ''اس زمانے میں لڑکیوں کو مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ مذہبی تعلیم دینا بے حد ضروری ہے ورنہ بہت برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔''[3]

اس ناول کا موضوع مغربی تعلیم یافتہ لڑکی کی بے جا آزادی اور بے راہ روی کی کہانی ہے۔

---

[1] نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ص ۳

[2] نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ص ۲

[3] فوٹو اسٹیٹ کاپی، مولانا آزاد لائبریری

ان کی ایک اور ناول 'ثریا' میں گریجویٹ لڑکیوں کا ذکر ہے جس میں ثریا بھی ہے۔ بیگم قمرالزماں کے ذکر میں لکھتی ہیں کہ، ''تھابرن کالج لکھنؤ کی تعلیم یافتہ تھیں۔''[1]

نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین احمد نے بھی اپنے ناولوں میں تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی ہے۔ اس زمانے میں تعلیم نسواں کی راہ میں جہاں یہ رکاوٹ تھی کہ معاشرہ اس کے لیے تیار نہیں تھا وہاں ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسکول کھولے جائیں تو پڑھانے کے لیے استانیاں کہاں سے آئیں۔ مشنری جو اسکول چلا رہے تھے اس میں ہندوستانی اور خاص طور سے مسلمان اپنی لڑکیوں کو بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بشیر الدین احمد نے اپنی ناول 'حسن معاشرت' میں اس مسئلے کی وجہ اس طرح بیان کی ہے: ''عورتوں کی تعلیم کے لیے کالج تو کالج ایک ڈھنگ کا مدرسہ بھی نہیں ہے، اس کا الزام کس پر ہے۔ عورتوں کو جاہل کس نے رکھا ہے، یقیناً مردوں نے۔ اپنی تعلیم اور ترقی کو مقدوم سمجھتے ہیں۔ آپادھاپی کا معاملہ ہے جو کچھ کررہے ہیں اپنے لیے مگر ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ نصف قوم ترقی کرے اور بقیہ نصف قوم قعر جہالت میں رہے تو قوم من حیث القوم ترقی کی معراج پر کبھی نہیں پہنچ سکتی۔''[2]

اپنی دوسری ناول 'اصلاح معیشت' میں وہ عورتوں کی جدید اور مکمل تعلیم کی حمایت کرتے ہیں، ''وہ تعلیم حاصل کرے مردوں کا ہاتھ بٹائیں۔''

محمد علی طیب کی ناول 'اختر وحسینہ' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ اس میں اس وقت کی تعلیم نسواں کی تحریکوں پر مصنف نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ تعلیم نسواں کے اس حد تک حامی ہیں کہ لڑکیاں تھوڑی بہت گھریلو تعلیم حاصل کرلیں۔ بہت زیادہ تعلیم حاصل کرنا اور آزادی حاصل کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہادی حسین ہادی نے ۱۹۰۸ء میں حجاب النساء میں پردے کی حمایت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ عورت اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ اس ناول کی ہیروئین پردے میں رہ کر کلکتہ امپریل اسکول میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ فن طبابت سیکھتی ہے۔ ایلو پیتھک ڈاکٹر بنتی ہے۔ شادی کے بعد اسپتال کھولتی ہے۔ پردہ دار عورتوں اور لڑکیوں کا وہاں بھی علاج کرتی ہے اور گھروں پر جاکر بھی۔ اس کا معائنہ لارڈ لٹن کی بیوی کرتی ہے، ایک لاکھ روپیہ عطیہ ہے اور سالانہ گرانٹ بھی منظور کرتی

---

[1] فوٹو اسٹیٹ کاپی، مولانا آزاد لائبریری

[2] ڈاکٹر وحید کوثر۔ اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات، اعجاز پریس، حیدرآباد، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۴

ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا نے بھی اپنی ناولوں میں عورتوں کی حمایت کی ہے۔ وہ شرفاء کی خاندانی زندگی کی ابتری کا ذمہ دار عورتوں کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ناول 'اختری بیگم' میں ہرمزی کے کردار کے ذریعے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم سے عورتوں کے تجربات وسیع ہوتے ہیں۔ ان میں جرأت اور بہادری آتی ہے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اس ناول کی ہیروئین بھی تعلیم یافتہ دکھائی گئی ہے۔ رسوا اس کا تعارف یوں کرتے ہیں۔ ''اچھی خاصی لکھی پڑھی دست حکم تھی۔ فارسی میں گلستاں بوستان اور ایسی ہی کتابیں پڑھ چکی تھی۔'' [1]

علامہ راشد الخیری کے زیادہ تر ناولوں کا موضوع عورتوں کی تعلیم ہے۔ مگر انھوں نے عورتوں کی اس تعلیم کی حمایت کی ہے جو صرف گھر کے دائرے میں ہو اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں معاون ہو۔ ان کے کئی ناولوں کا موضوع غلط مغربی تعلیم کے برے نتائج ہیں۔ یہ کوشش بھی اس لیے کی گئی ہے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اپنی ناول صبح زندگی کے ایک کردار استانی جی کے منہ سے وہ کہلاتے ہیں: ''میں نہیں چاہتی کہ لڑکیاں لکیر کی فقیر بنی رہیں۔ زمانے کا رخ دیکھ کر کام کرو۔ نہ ایسا کہ دوسروں کی ریس میں اپنی اصلیت بھول جاؤ۔'' [2]

شام زندگی کا موضوع عورتوں کی تعلیم کی اہمیت ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ سماج کو بہتر بنانے کا سب سے اہم ذریعہ عورتوں کی صحیح تعلیم اور تربیت ہے۔ وہ تعلیم کی اہمیت پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ وہ دماغ کو روشن کرتی ہیں۔ وسیع القلب بناتی ہے۔ گھریلو اور سماجی فرائض سے آگاہ کرتی ہے اور ان کو بحسن وخوبی پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ راشد الخیری کی ناول 'نجوگ' اور 'سمرنا کا چند' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔

'بنت الوقت' میں راشد الخیری نے اس ہندوستانی عورت کا کردار پیش کیا ہے جو انگریزوں کی نقل میں اپنی تہذیب اپنا مذہب بھلا بیٹھی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا کردار رابعہ سلطان کا ہے جو پڑھی لکھی مذہبی عورت ہے جو میلاد میں آکر تعلیم نسواں کے

---

[1] اختری بیگم، ص ۴۶

[2] ڈاکٹر وحید کوثر۔ اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات، اعجاز پریس، حیدرآباد، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۹۔۲۱۰

موضوع پر لیکچر دیتی ہے اور اس تعلیم کی مذمت کرتی ہے جس کی اشاعت 'بنت الوقت' کررہی ہے اور اصلی تعلیم کا مفہوم سمجھاتی ہے۔

اپنی ناول 'سرابِ مغرب' میں راشد الخیری نے ایک مدرسۂ نسواں کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مسلمان عورتوں کو جو پڑھ لکھ گئی ہیں اپنے یہاں مدرسے کھول کر اپنی جاہل بہنوں کو پڑھائیں اور ان کو مشنری عورتوں سے بچائیں جو اسکولوں میں تعلیم دے کر ہندوستانی لڑکیوں کو ان کے مذہب اور تہذیب سے بیگانہ کررہی ہیں۔ اس طرح انھوں نے یہ ثابت کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ تعلیم نسواں ہو، وہ رک نہیں سکتا۔ اگر عورتوں کی صحیح تعلیم نہ ہوگی تو وہ مشنری اسکول میں جاکر تعلیم حاصل کریں گی۔

پریم چند نے اپنی ناول 'گوشہ عافیت' میں ہندو سماج میں تعلیم نسواں کے فقدان اور اس کے برے نتائج کو موضوع بنایا ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھائی دہے میں تعلیم نسواں کے خلاف مخالفت کے طوفان میں کچھ دھیماپن آیا اور عورتوں کی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج کھلنے لگے۔ گاندھی جی نے عورتوں کو بھی جنگ آزادی میں شامل کرلیا۔ گوکہ ان لوگوں کی تعداد کم تھی مگر روز بروز ان میں اضافہ ہورہا تھا۔ ایک طبقہ اب بھی عورت کو صرف چاردیواری میں دیکھنا چاہتا تھا مگر اب عورتیں بھی باہر نکل رہی تھیں اور اپنے حقوق کی مانگ کررہی تھیں۔ جو پودا اٹھارہویں صدی کے آخری دہے میں ناول نگاروں نے لگایا تھا اب اس میں برگ و بار آنے لگے تھے۔ اب یہ رجحان عام ہورہا تھا کہ عورتوں کو تعلیم مرد ہی کی طرح حاصل کرنا چاہیے بلکہ خال خال ہی سہی ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی بیٹیوں کو انگلستان تعلیم کے لیے بھیجنا چاہتے تھے جس کی عکاسی پریم چند نے اپنی ناول 'گئودان' میں کی ہے: ''مسٹر کول ان خوش نصیبوں میں تھے جن کی تین لڑکیاں تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تینوں کو انگلستان بھیج کر تعلیم کی چوٹی تک پہنچادیں۔''[1]

ا۔ ظ۔ حسن کی روشنک بیگم کا موضوع تعلیم نسواں ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک ہندوستانی لڑکی ہندوستانی روایات کے ساتھ انگریزی تعلیم اور معاشرت اختیار کرتی ہے اور انگریز لیڈیوں کی ہمسری کرتی ہے۔ لندن کی معاشرت کی عکاسی کی اور ایسی مسلمان لڑکیوں کا ذکر کیا جو نہ صرف انگریزی بلکہ فرنچ بھی جانتی ہیں۔

---

[1] اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات۔ ص ۲۲۴

۱۹۴۷ء سے سات آٹھ سال پہلے کی ناولوں کے مطالعے سے یہ سامنے آتا ہے کہ تعلیم نسواں کا تصور کچھ بدلا ہے اور اب مسلمان لڑکیاں بھی اسکول اور کالجوں میں پڑھنے لگی ہیں جس کا نقشہ ہمیں عصمت کی 'ٹیڑھی لکیر' میں ملتا ہے جس کی ہیروئین شمن ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہے اور اسکول و کالج کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اے۔ آر۔ خاتون کی ناولوں میں 'شمع' اور 'افشاں' میں بھی مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کو اسکول اور کالج میں پڑھتا دکھایا گیا ہے۔ جو بورڈنگ میں رہتی ہیں مگر ہیروئین گھر میں رہ کر پرائیویٹ امتحان دیتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی معاشرہ اسکول اور کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی کو مثالی ماننے پر پوری طرح آمادہ نہیں ہے۔ اسی طرح صالحہ عابد حسین کی ناول 'عذرا' کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے جو ہندوستان کے بہت سے قصبوں کی طرح اکبر پور میں بھی ایک مسئلہ ہے۔ جہاں کچھ روشن خیال لوگ لڑکیوں کا مدرسہ کھولتے ہیں، لڑکیاں پڑھتی ہیں، پھر وہ آٹھویں سے دسویں تک ہو جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئین 'عذرا' اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہے جس پر اس کا انگلستان میں مقیم بھائی جو خود اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گیا ہوا ہے اس کو سمجھاتا ہے: ''پیاری عذرا! تمھارے خط اور مضمون سے مجھے اندازہ ہوا کہ تمہیں اس بات کا بہت صدمہ ہے کہ تم آگے تعلیم نہیں پا سکتیں۔ تمھاری یہ آرزو جائز اور شوق بجا ہے۔ خود میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میری بہن ابھی تعلیم حاصل کرے...... ہمارے یہاں کے رواج اور بندشیں اس قسم کی ہیں کہ اماں تمہیں اپنے سے الگ کسی جگہ بھیجنے پر تیار نہ ہوں گی اور انھیں مجبور کرنا ناممکن ہے۔ ان کی یہی عنایت بھی کیا کم ہے کہ انھوں نے سب باتیں اور اعتراضات سننے کے باوجود ہر طرح کی مالی مشکلیں اٹھا کر تمہیں دسویں تک پڑھا دیا۔ ہمارے ملک میں اب بھی ایسی لاکھوں لڑکیاں موجود ہیں جن کو معمولی نوشت و خواند کی بھی اجازت نہیں۔ وہ علم کی روشنی کے لیے تڑپتی ہیں۔''[1]

دوسری طرف عصمت کی 'ٹیڑھی لکیر' کی شمن مسلم گرلز ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرتی ہے، بورڈنگ میں رہتی ہے۔ پھر امریکن مشنری کالج میں تعلیم حاصل کرتی ہے جہاں پہنچ کر وہ مسلم گرلز ہائی اسکول کا موازنہ امریکن مشنری کالج سے یوں کرتی ہے۔ ''کہاں یہ حال کہ اگر کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر آ جائے تو لڑکیوں کو دورہ

---

[1] عذرا، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۰-۱۹۱

پڑ جائے، تہلکہ مچ جائے۔ کہاں یہ کہ کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوتے ہی یونیورسٹی کے لڑکوں سے لڑکیوں کو مہذب طریقے سے ملوایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک دعوت ہوتی، استانیاں اور پرنسپل خود ہر لڑکی کو ایک لڑکے سے ملواتیں اور تھوڑی دیر ساتھ رہتیں۔ پھر ان کو بے تکلف بات کرنے کو چھوڑ دیتیں۔''[1] مسلم گرلز اسکول میں ایک انگلستان پلٹ خاتون کا ذکر جو وہاں کی پرنسپل بن جاتی ہے۔ خود شمن ناول کی ہیروئین اسکول میں استانی بن کر محکمۂ تعلیم کی بدحالی کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ اس میں عورتوں کی تعلیم کا چرچا اور اس سے اٹھنے والے مسائل کا ذکر بھی شمن کے ذریعے ناول نگار نے کر دیا۔

فیاض علی کی 'شمیم' کی ہیروئین ماہ طلعت بھی پڑھی لکھی ہے۔ انگریزی میں یورپین عورتوں سے گفتگو کرتی ہے۔

---

[1] ٹیڑھی لکیر، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۱۷۵

(ب) پردہ

تعلیم کے بعد دوسرا اہم موضوع ہے جو اردو ناول نگاروں نے اپنی ناولوں میں پیش کیا ہے۔ چونکہ پردہ بہت حد تک عورت کی ترقی میں حائل تھا اور وہ عورت کی سماجی حیثیت کی بہتری میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ویسے تو دیکھا جائے تو شروع میں ناول نگاروں نے زیادہ تر پردے کی حمایت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ عورتوں کی ترقی کا مطلب بے پردگی نہیں ہے بلکہ پردے کے اندر رہ کر عورت علم حاصل کر سکتی ہے اور پردہ میں رہ کر ہی باہر کے کام اور انتظام کر سکتی ہے۔ ناول نگاروں نے اپنی ناولوں میں شروع سے ہی ایسے کردار پیش کیے ہیں جن میں عورتیں پردے کی پابندی کے ساتھ باہر کے کام اور انتظام دیکھتی ہیں۔ اکثریت ایسے ہی ناول نگاروں کی ہے۔ مولوی نذیر احمد اپنی ناول 'فسانۂ مبتلا' میں ایک کردار کے منہ سے دبی زبان میں یوں پردے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ''ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دونوں چیزوں کو ملا کر اپنے طرز معاشرت کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا دیا۔ مثلاً پردہ چلو۔ بلا شبہ اسلام کا حکم ہے کہ بیبیاں پردہ کریں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ایک پردے سے ہزار ہا مفسدوں کا انسداد ہوتا مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے پردے کو لازم کر لیا ہے افراط ہے۔''[1]

مگر عبدالحلیم شرر نے ابتداء ہی سے اپنی ناولوں میں پردے کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی ناولوں میں ایسے واقعات بیان کیے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں پردے کی رسم کی وجہ سے کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کے ناول 'مینا بازار' میں بھی انھوں نے پردے کی مخالفت کی۔ ان کی ناول 'بدر النساء کی مصیبت' کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس ناول کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں: ''تیس برس ہوئے یہ چھوٹا ناول پہلے پہل ایک مضمون کی حیثیت سے حیدر آباد کے رسالے 'تعلیم نسواں' میں شائع کیا گیا تھا اور غرض یہ تھا کہ رسالہ مذکور کے لائق ایڈیٹر مولوی محب حسین صاحب کو ان کی بیش بہا اغراض یعنی مروجہ پردے کی مخالفت میں مدد دی جائے۔''[2]

---

[1] فسانۂ مبتلا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص ۱۳۴

[2] بدر النساء کی مصیبت، الناظر پریس، لکھنؤ ۱۹۱۲، ص ۲

پردے کی حمایت کرنے والوں کا کہنا تھا کہ پردے کی رسم اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اپنی عورتوں کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی عزت اور عفت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کو بے پردہ کرکے بے حرمت نہیں کرتے، اس کا جواب بھی شرر نے بدر النساء کے دیباچے میں یوں دیا ہے اور اس وقت انھوں نے بالواسطہ طور پر عورت کو کموڈٹی ماننے پر اعتراض کیا ہے:
''جس طرح کسی بڑے موتی یا ہیرے کو آپ سرمایہ ناز سمجھ کر بندوق میں مقفل کرتے ہیں اسی طرح چاہتے ہیں کہ عورتوں کو بھی مایۂ عزت قرار دے کر ڈبیا میں بند کرلیں۔ خلاصہ یہ کہ عورت ہے تو بڑی قابل قدر چیز مگر اس کا شمار غیر ذی روح اشیا میں ہے۔''[1]

شرر نے اپنے دوسرے ناول 'مینا بازار' میں پردے کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے: ''پردے میں رہنے والی عورتیں جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں اور قیدیوں کی طرح اپنے گھروں میں دبی کچلی پڑی رہتی ہیں ایک دوسرے سے ملیں جلیں۔ زمانے اور حالات سے واقف ہوں۔''[2]

ڈاکٹر شریف احمد اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'عبدالحلیم شرر فن اور شخصیت' میں کہتے ہیں: ''قیامِ انگلستان نے شرر میں پردے کے خلاف شدید ردّ عمل پیدا کر دیا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے مضامین لکھے، لیکچرز دیے، مگر اس موضوع پر ان کی ناول 'بدر النساء کی مصیبت' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان معنی میں شرر کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے ایسے مسئلے پر پلاٹ کی عمارت کھڑی کی کہ اس وقت جس پر بات کرتے ہوئے بڑے بڑے روشن خیال اور باہمت لوگ گھبراتے تھے۔''[3]

شرر کے بعد تو لوگوں نے اس موضوع کو ناول میں لیا بھی مگر ان سے پہلے کسی کی یہ جرأت نہیں ہوئی۔ وہ بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ مذہب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں پردہ کی مخالفت مذہبی نقطۂ نظر سے کی اور قرآن، حدیث سے اس پردے کو غلط قرار دیا جو اس زمانے میں مسلمانوں میں رائج تھا۔ جہاں تک شرر کا تعلق ہے: ''وہ عورتوں کو چہار دیواری کا پابند رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس عہد کے

---

[1] بدر النساء کی مصیبت، ص ۲۵
[2] مینا بازار۔ یونائیٹیڈ انڈیا پریس، لکھنؤ، ص ۹
[3] عبدالحلیم شرر۔ شخصیت اور فن۔ گوہر پبلی کیشنز، دہلی، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۶

رسم و رواج کے مطابق پردے کی پابندی نہ صرف مسلم سوسائٹی میں بلکہ ہندو معاشرت میں بھی اتنی ہی سختی سے کی جاتی تھی۔''[1]

انھوں نے 'کامنی' میں بار بار اور کھل کر پردے کی رسم کی مخالفت کی اور 'فسانہ آزاد' میں وہ پردے کے بارے میں کہتے ہیں: ''ہم تو سمجھتے ہیں کہ زیادہ پردہ بھی خراب ہے اور زیادہ آزادی بھی۔ پردہ دل کا مقدم ہے۔ سب سے بڑا بس یہی پردہ ہے، گھونگھٹ اور برقع بس دیکھنے بھر کا ہے۔ بھلا کپڑے کے پردے نے کہیں دل صاف رکھا ہے۔''[2]

جب کہ عام طور پر وہ ناول نگار جو پردے کے حق میں نہیں تھے وہ بھی ڈر کے مارے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ لوگ عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اس لیے زیادہ تر لوگ پردے کی حمایت کرتے جیسے کہ 'نئی روشنی' ناول جو نواب میر محمد علی کی تصنیف ہے جس میں ان لوگوں پر تنقید کی گئی ہے جو تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ بے پردگی کا پرچار کرتے ہیں۔

حجاب النساء ۱۹۰۸ء میں ہادی حسین ہادی نے دو بہنوں کے کردار پیش کیے ہیں۔ ایک نوری دوسری ہرمزی۔ نوری پردے میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بنتی ہے، شفاخانہ کھولتی ہے۔ نیک نامی کماتی ہے۔ اور ہرمزی مغرب کی لیڈیوں سے متأثر ہو کر پردہ چھوڑ کر آزاد ہو جاتی ہے۔ ایک کے بعد ایک عشق کرتی ہے اور اپنی زندگی برباد کر لیتی ہے۔ ذلت و رسوائی اس کے ہاتھ آتی ہے۔

گوڈر کے لال میں ثریا جبیں کہتی ہیں کہ ہم عورتیں بے پردہ نہیں ہونا چاہتیں۔ ہمیں پردہ دل سے عزیز ہے اور پردے میں رہ کر ہی ہم تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مذہب کی رو سے جو ہمیں حقوق حاصل ہیں ان سے لینا چاہتے ہیں۔ طیبہ بیگم کی ناول انوری بیگم میں دبے الفاظ میں پردے کی بہت زیادہ سختی کی مخالفت کی گئی ہے۔ مثلاً ورزش کی خاطر عورتوں کو پردے کی بندش کم کر دینا چاہیے اس لیے کہ ورزش عورتوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی طرح عباسی بیگم اپنی ناول شوکت آراء میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی اور پردے کے موضوع پر دبے الفاظ میں اظہارِ خیال کرتی ہیں۔ ''ہر زمانے میں اور ہر وقت اچھی صحبتوں

---

[1] فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور، نذیر احمد سے پریم چند تک، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۵۴

[2] فسانۂ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بازار، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۵

میں بچوں کا بیٹھنا اچھا سمجھا گیا ہے اور شاید ہمیشہ سمجھا جائے، مشکل پڑتی ہے تو پردہ دار بچیوں کے لیے جو چار دیواری کے اندر ماں بہنوں کو دیکھتی ہیں اور مہینہ میں ایک دو مرتبہ پھوپھی خالہ اور ایسی ہی کنبہ والوں کے یہاں ہو آئیں۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کی معاشرت کے ہاتھوں پردہ نشیں بچیوں کو اچھی صحبت ملتی ہی نہیں۔'' [1]

نذر سجاد حیدر نے براہ راست تو اپنی ناولوں میں پردہ کی مخالفت نہیں کی مگر اپنی ناولوں میں بالواسطہ عورتوں کو بے پردہ اور آزادی سے لوگوں سے ملتے جلتے دکھایا گیا ہے۔ مثلاً 'حرماں نصیب' کی ہیروئین پردہ نہیں کرتی۔ اپنی ناول ثریا میں کہتی ہیں: '' کلکٹر صاحب بہادر نے پہلی بیگم صاحبہ کی طرح ثریا جبیں کو بالکل پردہ نہیں کرایا تھا۔ وہ مثل یورپین لیڈیوں کے سوسائٹی میں داخل تھیں۔ بیگم قمر الزماں بھی سندر لال ستیش چندر کلکٹر صاحب اور مکر جی کے سامنے ہوتی تھیں۔'' [2]

'اشک حسرت' کے مصنف حاجی محمد احسن وحشی بلگرامی نے بھی اپنی ناول میں عورتوں کے رواجی پردے کی سخت الفاظ میں مخالفت کی ہے: '' خدا نے کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ عورتیں چار دیواری میں بند رکھی جائیں۔ یہ سب مردوں کے ڈھکوسلے ہیں۔'' [3]

عظیم بیگ چغتائی مزاح نگار تھے۔ انھوں نے اپنی ناول شریر بیوی میں سخت پردے کا عبرتناک انجام دکھایا ہے کہ پردے کی وجہ سے ایک رواجی پردے کے حامی اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اس ناول میں انھوں نے عورتوں کو چار دیواری میں بند رکھنے اور پوری طرح مردوں کی محتاج بنانے کی مذمت کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ پردہ نظر کا ضروری ہے۔ عورت کو باہری دنیا سے علیحدہ رکھنے کا نام پردہ نہیں ہے۔ میاں بیوی میں بہت Understanding دکھائی ہے۔ برابری سے رہتا دکھایا گیا ہے۔

مرزا رسوا بھی اپنی ناول 'اختری بیگم' میں پردے کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں: '' ڈنڈا ڈولی فقط ہندوستان میں ہے کسی ملک میں یہ دستور نہیں۔ پانو توڑ کے

---

[1] شوکت آرا، ص ۲۲۲

[2] ثریا، زیراکس کاپی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص ۱۰

[3] اشک حسرت، ص ۱۰

عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا کوئی اچھا دستور نہیں ہے۔"[1]

آگے چل کر کہتے ہیں: "میں عورتوں کو کال کوٹھریوں میں بند رکھنے کو بہت برا جانتا ہوں۔عورتوں کو خود اپنی حرمت کا خیال ہوتا ہے۔مردوں کو ان پر اعتبار کرنا چاہیے۔"[2]

راشد الخیری بھی اس پردے کے مخالف ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج تھا اور مسلمانوں کو یہ گمان تھا کہ اسلام میں اس قسم کے پردے کا حکم ہے۔یعنی عورت گھر کی چار دیواری میں گھٹ کر مر جائے۔اس کا پور بھی کوئی نہ دیکھے، نہ آواز سنے مگر اس کا ساتھ وہ اس بے پردگی کے بھی قائل نہیں ہیں کہ عورتیں کھلے منہ مردوں کے ساتھ گھومیں۔جلسے جلوس میں جائیں۔وہ ان مغرب زدہ لوگوں کے خلاف ہیں جو سرے سے پردے کو مسلمان گھرانوں سے اٹھا دینا چاہتے ہیں مگر وہ اندازہ کر رہے تھے کہ وہ بھلے ہی اس کے مخالف ہوں مگر دھیرے دھیرے پردہ ختم ہو جائے گا۔اپنی ناول 'بنت الوقت' میں کہتے ہیں: "یہ جوہر (پردہ) جس نے مسلمانوں کی اچھی بری لاج، تھوڑا بہت بھرم رکھ لیا تھا مسلمانوں سے وداع ہو رہا ہے۔اک روز ایسا آئے گا کہ پردے کی خوبی سے تاریخ اسلام قطعی محروم ہوگی۔"[3]

صالحہ عابد حسین کی ناول 'عذرا' میں ایک قدامت پسند کردار جو عذرا کی خالہ ہیں، وہ لڑکیوں کے رشتہ داروں کے گھر تقریب میں بھی جانے کے خلاف ہیں۔خاندان کے رشتے دار لڑکیوں سے بھی میل جول کو ناپسند کرتی ہیں۔یہاں تک کہ عذرا جب اپنے ولایت پلٹ بھائی کے ساتھ دہلی آتی ہے تو صرف اس کا کالج میں داخلہ اس لیے نہیں ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی پردے کا انتظام نہ تھا۔وہ پردے ہی میں رہ کر عورتوں کا رسالہ نکالتی ہے۔اپنے میاں کو چق کے پیچھے کھڑے ہو کر وطن کی خاطر جیل جانے کے لیے رخصت کرتی ہے اور پردے ہی میں رہ کر وہ 'آزادی' اخبار کی ارادت کرتی ہے۔اس ناول کا مردانہ کردار محمد احسان جسے روشن خیال دکھایا گیا ہے، عورتوں کی تعلیم کا حامی بھی ہے۔یہ دیکھ کر کہ، "عذرا برقع پوش دفتر جاتی ہے۔تمام کاغذات ایک چھوکرا اس کے پاس لاتا لے جاتا ہے۔جو کچھ بات کرنی ہوتی

---

[1] اختری بیگم، شاہی پریس لکھنؤ، ص ۱۱۱

[2] اختری بیگم، شاہی پریس لکھنؤ، ص ۱۱۱

[3] بنت الوقت، برقی پریس دہلی، ۱۹۳۳ء، ص ۴۷

ہے چق کے پیچھے سے کرتی ہے۔''[1] مطمئن ہو جاتا ہے۔

فیاض علی کی ہیروئین ماہ طلعت بھی برقعہ پہن کر عورتوں کے حقوق کی مانگ کرنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر شوہر کے احکام مذہب کے اصولوں کے برعکس ہوں تو لڑکیوں کو قرآن کے احکام کو ترجیح دینا چاہیے۔ وہ شوہروں کے ظلم کے خلاف بھی آواز اٹھانے کے حق میں ہے۔

عصمت کی 'ٹیڑھی لکیر' میں دکھایا گیا ہے کہ مسلم معاشرہ میں پردے کا رواج شدت سے ہے۔ مگر خال خال سہی اب کالج اور اسکولوں کی تعلیم یافتہ عورتیں بے پردہ ہو رہی ہیں۔

اس سے پہلے عزیز احمد نے اپنی ناول 'ہوس' میں پردے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس میں انھوں نے پردے میں رہنے والی لڑکیوں کی گھٹن، جنس سے ناواقفیت، سختی سے مردوں سے علیحدگی، اور اس علاحدگی کی وجہ سے اور بھی مخالف جنس سے کشش کا احساس اور اس کے مضر نتائج۔ ایک لڑکی کے اپنے کزن سے ناجائز تعلقات ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ مصنف یہ بتاتے ہیں کہ: ''وہ عام پردہ نشین عورتوں کی طرح مرد سے ناواقف تھی۔ مرد اس کے لیے، ہوس کی تمناؤں کے لیے، اس کی چھپی ہوئی آرزوؤں کے لیے ایک معمہ تھا۔ اگر یہ پردہ نہ ہوتا تو یہ خطرناک اجنبیت، یہ تباہ کن ترغیب نہ ہوتی۔ پردے نے خود اس تباہی کا سامان کر دیا جس سے بچنے کے لیے پردے کا اہتمام کیا گیا تھا۔''[2]

۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستانی معاشرے میں پردے کا اچھا خاصا رواج تھا۔ خاص طور سے شمالی ہندوستان میں، مگر خال خال بے پردہ عورتیں بھی معاشرے میں قبول کی جانے لگی تھیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد عام طور پر پردہ کا رواج تیزی سے ختم ہونا شروع ہوا اور چند دنوں میں بہت حد تک ختم ہو گیا۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ پردہ کا رواج اسی طرح معاشرے میں جڑ پکڑے ہوئے تھا اور اس کی مخالفت کرتے لوگ جھجکتے تھے۔ اسی لیے ایک طرف ہمیں ناولوں کے ابتدائی دور میں شرر جیسے لوگ ملتے ہیں جو پردے کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور مذہبی دلائل سے رواجی پردے کو غلط سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک کے بعض ناولوں کا موضوع پردہ ہے اور ناول نگار اس کوشش میں مصروف ہیں کہ اس رواج کے مضر اثرات سے معاشرے کو آگاہ کیا جائے۔

---

[1] عذرا، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، اگست ۱۹۸۷ء، ص ۷۷

[2] عزیز احمد، ہوس، مکتبہ جدید لاہور، سن ندارد، ص ۶۰

(ت) بیوہ کے مسائل:

ہندوستانی عورتوں کے لیے بیوگی ایک بڑی مصیبت تھی۔ شوہر تو مرجاتا تھا اور عورتیں زندگی درگور ہو جاتی تھیں۔ بلکہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ چتا میں جلا دیا جاتا تھا۔ ''آگ کے شعلوں میں گھر کر ان کی چیخوں کو دبانے کے لیے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ستی ماتا کی جے۔''[1] زیادہ تر عورتیں بیوگی کی ناقابلِ برداشت تکلیفوں کو سہنے کے بجائے اس طرح کی موت کو ترجیح دیتی تھیں۔ ہندوستان میں بیواؤں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس کی وجہ بچپن کی شادی اور کئی شادیوں کا رواج تھا۔ برہمنوں کی شادی میں کنیادان کی رسم اسی لیے رکھی کہ عورتوں کو جب ایک دفعہ دان کر دیا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس مرد کی ہو جاتی ہیں اور ایک دفعہ جو دان دے دیا جائے وہ کسی اور کو دان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصور عورت کو کموڈٹی سمجھنے کا ہے کہ پہلے وہ باپ یا بھائی کی ملکیت تھی اور بعد میں شوہر کی۔ مرد کے جذبۂ رقابت نے عورت کو اپنے بعد بھی کسی اور کی ہونا گوارا نہ کیا اور ایسے قوانین بنا دیے کہ وہ یا تو اس کے ساتھ مر جائے یا پھر زندہ رہے بھی تو مُردوں سے بدتر۔ زندگی کی ہر خوشی، ہر لذت سے محروم ہرے۔ شوہر کا نہ رہنا اس کی بدقسمتی ٹھہری اور اس کی سزا مردوں کے سماج نے عورت کو دل بھر کر دی۔ راجہ رام موہن رائے سے لے کر گاندھی جی تک سب مصلحین نے ہندوستانی سماج میں بیوہ کی حالت کو بہتر بنانے پر زور دیا۔ ان کے لیے آشرم کھولے گئے، ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا کیونکہ اس کا ایک حد تک تعلق اس بات سے بھی تھا کہ عورتیں خود کفیل نہیں تھیں۔ نذیر احمد نے سب سے پہلے 'بنات النعش' میں بیواؤں کے نکاحِ ثانی کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ وہ تو کچھ عورتوں کے جگر ہیں اور جگر بھی کیا خاک ہیں یوں کہو پرلے درجے کی بدقسمتی ہے کہ بیوگی کی مصیبت زندگی بھر جھیلتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ، ''قیامت میں نفسی نفسی کا دن ہوگا کہ کسی دوسرے کے دکھ درد کی ذمہ داری کی ذری پرواہ نہ ہوگی لیکن ہمارے دیکھ میں تو بیوہ عورتوں کے لیے تو اب بھی قیامت ہے۔ منہ سے کہنے کو ہر کوئی کہے گا۔ بیوگی بڑی آفت ہے۔ ہم تو بڑی آفت کے اس وقت قائل ہوں

---

[1] پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ شمیم نکہت،، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۰

جب لوگوں کو آفت رسیدہ کے لیے کوئی تدبیر کرتا دیکھیں۔[1] اس لیے اردو ناول نگاروں نے ابتداء ہی سے اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔

ان کی ناول 'ایامی' کا موضوع یہی بیوہ ہے جس میں انھوں نے آزادی کے کردار میں ایک ہندوستانی مسلمان بیوہ کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ بقول ڈاکٹر زینت بشیر، اس ناول میں انھوں نے عقد بیوگان کے مسئلے پر قلم اٹھا کر صدیوں سے چلی آنے والی روایت سے بغاوت کر کے غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ ''بیوگی کہنے کو تو پانچ حرفی لفظ ہے لیکن اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اس کا صحیح اندازہ ایک بیوہ ہی کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ بیوگی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عذاب ہو ہی نہیں سکتا۔''[2]

نذیر احمد نے اپنی ناول میں بہت کھل کر بیوہ عورتوں کی شادی کی حمایت کی۔ اس بات کو انھوں نے قرآن اور حدیث سے ثابت کیا کہ بیوہ کی شادی کی اسلام اجازت دیتا ہے اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اسی لیے خواجہ مشتاق بیوہ آزادی کو نکاح کرنے کی ترغیب دیتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس طرح وہ پہلو کر کے اپنی دوسری بیوہ بہنوں کے لیے راستہ کھول دے گی: ''بس تم نکاح کر کے نہ صرف اپنی مصیبت رفع کرو گی بلکہ سینکڑوں ہزاروں بیواؤں کی مصیبتیں جو فقط اتنے اشارہ کی منتظر ہیں کہ کوئی تم جیسی خداترس آگے بڑھے اور یہ پیچھے ہو لیں۔''[3]

اس ناول میں نذیر احمد نے یہ دکھایا کہ بیوہ عورت کو اگر وہ نوجوان ہو جو اکثر صورتوں میں ہوتی تھیں، کہ یہاں بچپن کی شادی کا رواج تھا تو صرف روٹی کپڑے اور سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جنسی تشنگی بھی ہوتی ہے جو ان میں طرح طرح کی نفسیاتی گتھیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ طرح طرح کے ذہنی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اپنی دوسری ناول 'فسانۂ مبتلا' میں بھی انھوں نے بیواؤں کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ ان کا ایک کردار عارف کہتا ہے: ''سب سے بڑا ظلم جو ہم نے اپنی عورتوں پر کر رکھا ہے یہ ہے کہ بیوہ کا دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے۔ ہزار ہا اللہ کی بندیاں ہیں کہ انھوں نے شوہر کا منھ تک نہیں دیکھا اور نصیبوں

---

1. بنات النعش۔۔
2. نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد، ۱۹۹۱ء، ۴۱۹
3. ایامی پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۴۲

پر ایسے پتھر پڑے کہ رانڈ ہو گئیں۔ ہندوؤں کی طرح ستی ہو کر ایک بار جل کو مرنا ساری عمر کے جلاپے سے ہزار بہتر تھا۔"[1]

ہندوستانی تہذیب میں عورت شادی سے پہلے باپ بھائی کی عزت سمجھی جاتی ہے اور شادی کے بعد شوہر کی۔ اسی لیے بیوہ کی شادی کو شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ بیوہ کی شادی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ مرحوم شوہر سے بے وفائی ہے۔ بیوہ عورت کس طرح اپنے کو دکھ دے کر اپنی جنسی خواہشات کو کچلنے کی کوشش کرتی ہے: "میں نے بہتری تدبیریں کیں کہ کسی ایک شغل میں لگ جاؤں کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آئے۔ پورے ایک برس صوم داؤد رکھ کر دیکھے کیونکہ میں نے پڑھا تھا کہ روزہ اور روزہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا سا۔ ایک دن بیچ کا نفس کشی کے لیے بہت مفید ہے۔ مہینوں سر نہ دھویا۔ ہفتوں بالوں میں کنگھی نہ کی۔ کپڑے نہ بدلے۔ اچھا کھانے کی قسم کھائی نہ اچھا پہننے کا عہد کیا مگر معلوم ہوا کہ کسی چیز کا قصور نہیں۔ خود میری ہستی نکاح کے مقتضی ہے۔"[2]

ایک اور جگہ آزادی اپنے سے دوسری بیواؤں کا موازہ کر کے کہتی ہے: "ان بچاریوں کے شوہر فوت ہوئے نہ وہ ضرور فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے نکاح ہوئے تھے۔"[3]

ایک اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں بیوہ عورتوں کی جنسی خواہشات کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ایک جگہ آزادی کہتی ہے: "جسم پر میرا بس چلتا تھا اور میں نے اس کی حفاظت کی۔ آنکھ غیر محرم پر پڑنے نہیں پائی۔ زبان کو گناہ کی بات بولنے نہیں دی۔ پاؤں بدراہ نہیں چلا، لیکن دل پر میرا اختیار نہ تھا۔ وسوسوں کو کیوں کر روکتی۔ خیالات کو کس طرح ٹالتی۔ بس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل، نہ میں اس کو بے گناہ سمجھتی، نہ بے گناہ کہتی۔"[4]

نذیر احمد نے یہ ناول ۱۸۹۱ء میں لکھا تھا اور اس وقت اس طرح کھل کر بیوہ کی شادی کی حمایت کرنا اور بیواؤں کی جنسی خواہشات کی اہمیت کو ظاہر کرنا اتنی ہی جرأت کی بات

---

[1] فسانۂ مبتلا، الاشاعت مسلم منزل دہلی، ۱۸۸۵، ص ۱۷۶

[2] ایضاً، ص ۱۷۷۔۱۷۸

[3] "" ص ۱۸۱

[4] "" ص ۱۷۵

ہے جتنی شرر کی پردے کی جرأت مندانہ حمایت۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ پردہ کا مسئلہ بھی ایسا نازک تھا کہ جسے عام طور پر ناول نگار اٹھاتے گھبراتے تھے جو اس کے خلاف بھی تھے۔ زیادہ تر پردے ہی کو ضروری سمجھتے تھے۔

نذیر احمد کے ہمعصر سرشار نے بھی بیوہ کے مسئلے کو پہلے فسانہ آزاد میں اور پھر 'کامنی' میں اس سے بھی زیادہ کھل کر اٹھایا ہے کہ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے جب کہ لڑکیوں کی شادی بچپن ہی میں ہو جاتی تھی اور وہ اپنی پہاڑ سی زندگی اور جوانی بیوگی کی حالت میں گزارتی ہیں۔ خاص طور سے ہندو بیوہ کی جس قدر اذیت ناک زندگی تھی، سرشار کو اس کا پورا پورا احساس ہے۔ انھوں نے ایسی رسوم کی اصلاح پر زور دیا ہے کہ جن کی وجہ سے بیوہ کو سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ انھوں نے بیوہ کی دوسری شادی کی زبردست حمایت کی جس کو اس زمانے میں گناہ سمجھا جاتا تھا اور یہ بات نذیر احمد کے مقابلے میں سرشار کے لیے اور زیادہ مشکل تھی کہ اسلام میں بیوہ کی شادی جائز ہے اور اس کے لیے قرآن وحدیث سے دلائل دی جا سکتی ہیں مگر سرشار نے بھی اس کا مذہبی جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندو بیوہ کی زندگی جس قدر اذیت ناک ہوتی تھی اس کا سرشار کو پورا احساس ہے۔ وہ اس مظلوم طبقے سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے ایسی رسوم کی اصلاح پر بہت زور دیا ہے جن کی تکمیل میں بیوہ کو سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں۔

رشیدۃ النساء نے بھی اپنی ناول 'اصلاح النساء' میں بیوہ کو منحوس سمجھنے کی مخالفت کی ہے اور اس بات کی مذمت کی ہے کہ بیوہ کو شادی بیاہ کے موقعوں پر ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس کو کسی چیز میں ہاتھ لگانے کی مخالفت ہوتی تھی جب شادی کے موقع پر ایک بیوہ خاتون دلہن کے جوڑے پر ہاتھ رکھنے سے گھبراتی ہیں تو دولہا کی ماں ان سے کہتی ہے: ''خالہ اماں اللہ اللہ کیجیے، آپ کو میرے سر کی قسم، امتیاز الدین کی دلہن کے کپڑے چھوئیے اور خالہ کا ہاتھ کپڑوں پر رکھ دیا۔''[1]

اپنی ناول 'دلچسپ' میں عبدالحلیم شرر نے بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کی ہے۔ انھوں نے اپنی اس ناول میں صاف صاف کہا ہے کہ اسلام میں بیوہ کو شادی کی اجازت ہی نہیں بلکہ یہ کہ اس کا اسی طرح کا فطری حق ہے جس طرح مرد کا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی

---

[1] اصلاح النساء، زیراکس کاپی، خدا بخش لائبریری، ص ١٦

بتایا ہے کہ بیوہ کے اوپر جو طرح طرح کی پابندیاں ہیں جن سے وہ زندگی کی ہر لذت اور خوشی سے محروم کردی جاتی ہے یہ اسلامی نہیں ہیں بلکہ مقامی رسم ورواج کو اختیار کرلیا گیا ہے۔

محمد طبیب کی ناول 'گورا' کا موضوع بھی عقد بیوگان ہے۔ اس میں بیوہ عورتوں پر جو ظلم روا رکھے جاتے ہیں ان کی مذمت ہے اور اس پر زور ہے کہ اس کی شادی ہونا چاہیے۔ ہندو مذہب میں بھی اس کی گنجائش ہے۔ اسلام تو اس کا سخت حامی ہے۔ ایک کردار چندرسین جو ایک نوعمر بیوہ سے محبت بھی کرتا ہے، آریہ سماج کے منعقدہ جلسوں میں عقد بیوگان کی سخت حمایت کرتا ہے۔ اس پر لیکچر دیتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں قصہ بیان کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیوہ کی شادی نہ کرنے کے کیا خراب نتائج نکلتے ہیں۔

راشدالخیری کی ناول 'نوحۂ زندگی' کا موضوع ہندوستانی بیوہ کی زندگی ہے جو اس قدر تکلیف دہ ہے کہ وہ آخر کو خودکشی کرلیتی ہے۔ اس پر مصنف لکھتے ہیں: ''یہ اس قوم کی کیفیت ہے جس نے خاکِ عرب سے اٹھنے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صدا پر لبیک کہا اور دعویٰ کیا کہ اسلام سے زیادہ کسی دنیا میں کسی مذہب نے عورت کی حمایت نیں کی۔ اگر منہ پر آنکھیں موجود ہوں اور پہلو میں دل ہو تو مسلمان ذرا ان بیوہ عورتوں کی حالت دیکھیں جن کو مردوں کے مظالم نے دنیا کی ہر نعمت سے محروم کردیا ہے۔''[1]

دوسری ناول 'شب زندگی' میں بھی وہ بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ کیونکہ دوسری صورت میں ایک تو عورت کے ساتھ ناانصافی ہے کہ اس کو بیوگیکی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے، دوسرے اس سے معاشرتی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ شب زندگی میں نسیمہ جو اس ناول کی ہیروئین ہے اپنی بیوہ بہو کا نکاح کرادیتی ہے: ''بیوہ بہو کا نکاح کردینا آسان نہ تھا دل پر جو گزری سو گزری وہ اسی کا دل جانتا ہوگا مگر خدا اور رسول کے ارشاد میں فرق نہ آنے دیا۔''[2]

پریم چند کے ابتدائی ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کا موضوع ہندو بیوہ کی حالت کا سدھار ہے۔ وہ آریہ سماجی تھے اور آریہ سماج نے ہندو مذہب کی قدامت پرستی کے خلاف آواز

---

[1] نوحۂ زندگی، محبوب المطابع دہلی، ۱۹۱۹ء، ص ۸۳

[2] شب زندگی حصہ اول، عصمت بک ایجنسی دہلی، ۱۹۳۳ء ص ۱۶۸

اٹھائی تھی اور عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے بھی کوشش کی تھیں۔اس ناول میں پریم چند اس رسم کو ختم کرنے کے حق میں ہیں کہ شادی کے بعد ہندو بیوہ کا سر منڈا دیا جائے۔ دوسرے وہ ناول کے ہیرو کی شادی بیوہ سے کراتے ہیں۔'ہم خرما و ہم ثواب' میں ہیرو جب پورنا (جو ایک بیوہ ہے) کو خط لکھ کر شادی کا پیام دیتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے اور کہتی ہے: ''بھلا بدھواؤں کی کہیں شادی ہوئی ہے۔وہ بھی برہمن کی چھتری سے۔میں نے اس قسم کے قصے کتابوں میں پڑھتے تھے جو بابو امرت رائے مجھے دے گئے ہیں مگر وہ قصے ہیں تم نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔''[1] اس کی ملازمہ بلو اس کا جواب دیتی ہے ''بال سفید ہو گئے مگر ایسا بیاہ نہیں دیکھا۔''[2]

بہت پس و پیش کے بعد پورنا شادی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔مگر اس شادی پر سناتن دھرم کے ماننے والے ہنگامہ کر دیتے ہیں۔اسے دھرم کی بے عزتی سمجھتے ہیں۔شادی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔مگر پولیس اور فوج کی مدد سے اس ہنگامے پر قابو پا لیا جاتا ہے اور شادی ہو جاتی ہے۔پورنا کی موت کے بعد امرت رائے اپنی محبوبہ سے شادی کر لیتا ہے۔

اس ناول میں پریم چند مندروں میں ہونے والی بے راہ روی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، جہاں بیوائیں جاتیں تو پوجا پاٹ کے لئے ہیں مگر وہاں جا کر پجاری کے روپ میں بھیڑیے ان کے ساتھ گل چھرے اڑاتے ہیں۔اس کے بعد اس ناول کے پیٹرن پر وہ دوسری ناول ''بیوہ'' لکھتے ہیں۔تھوڑی سی رد و بدل کے بعد ان ہی کرداروں کے ساتھ وہ ہندو بیوہ کے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔اس کی ذہنی نفسیاتی اور جنسی گتھیوں کو موضوع بحث لاتے ہیں اور اس کا سرا عورت کی معاشی Depedence سے ملاتے ہیں۔بیوہ کا ایک کردار پورنا جو خود بیوہ ہے اپنی دوست سمترا کی اس بات کا جواب کہ مرد چونکہ کما کر کھلاتا ہے اسے عورت پر رعب جمانے کا حق ہے، یوں جواب دیتی ہے: ''بس بس تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی۔یہی میں سمجھتی ہوں کہ بیچاری عورت کما نہیں سکتی اس لئے اس کی یہ درگت بنتی ہے۔'' آگے چل کر بیوہ کا دوسرا کردار پریما بیواؤں کے بارے میں کہتی ہے:'' میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اگر ان کو بہتوں کو روکھی سوکھی روٹیوں اور موٹے جھوٹے کپڑوں

---

[1] پریما، ہم خرما و ہم ثواب، (دیوناگری رسم الخط میں) ص ۱۶۸
[2] پریما، ہم خرما و ہم ثواب، (دیوناگری رسم الخط میں) ص ۱۸۷

کا سہارا بھی پیدا ہو جائے تو وہ آخری وقت تک اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کرتی رہیں۔ عورت بہت مجبوری کی حالت میں بدچلن ہوتی ہے۔"[1]

بیوہ میں پریم چند ایک نوجوان بیوہ پورنا کا کردار پیش کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ہندو بیوہ کی زندگی میں آنے والے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔"ایک جملہ جو انھوں نے پورنا سے کہلوایا ہے، ہندو سماج میں بیوہ کی حالت کو ظاہر کرنے کو کافی ہے"ہائے بھگوان رنڈاپا کیا کلنک کا دوسرا نام ہے۔" اس ایک جملے میں بیوہ کی ساری کہانی پریم چند نے سمو دی ہے۔"[2]

پریم چند نے "بیوہ" کی شادی پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے اس بات کو نہایت ناانصافی اور ظلم پر مبنی قرار دیا ہے کہ شوہر کی موت کے بعد عورت کو دوبارہ شادی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بیوہ میں پریم چند کہتے ہیں"مردوں نے یہ قاعدہ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ چاہے رشی چاہے مہاتما، میں اسے انسانی طبقہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہوں، عورتوں کے لئے شوہر پرستی کی بیخ لگا دی۔ دوبارہ بیاہ ہوتا تو اتنی اناتھ عورتیں ان کے پنجہ میں کیسے آتیں؟ بس یہی سارا راز ہے۔ انصاف تو ہم تب سمجھتے جب مردوں کو بھی ویسی ہی ممانعت ہوتی۔"[3]

پریم چند نے اس ناول میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ جن لوگوں کی پہلی بیوی ختم ہو چکی ہو دوسری شادی کسی بیوہ سے کریں۔ اس طرح بھی بیوہ کا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائے گا۔

اس ناول کا ہیرو امرت رائے کسی مصلح کی بیوہ کے مسئلے پر تقریر سن کر یہی طے کرتا ہے اور اپنی کنواری سالی پریما سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ بیواؤں کے آشرم کھولتا ہے اور اسی طرح بیواؤں کو بے آسرا ہونے اور مالی طور پر خود کفیل ہونے کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ گوکہ پریم چند اپنی پہلی ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' میں امرت رائے کی شادی بیوہ سے کرا دیتے ہیں مگر اس میں وہ ایسا نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ جس

---

[1] بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۶

[2] پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ شمیم نکہت، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ص ۱۶۰

[3] بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۱۹۴۱ء، ص ۱۳۰

سماج میں بیوہ کو ایک لعنت سمجھا جاتا ہو اس پر ہر خوشی کا دروازہ بند ہو۔ اس پر زندگی کی ہر لذت حرام ہو، وہ منحوس سمجھی جائے۔ جہاں اسے شوہر کے ساتھ جل جانے پر مجبور کیا جائے وہاں ایک دم بیوہ کی شادی کی بات لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ پہلی ناول پر جو سماج میں ردّ عمل ہوا ہوگا اس لیے بھی انھوں نے اپنی ناول 'بیوہ' میں بیوہ کی زندگی کے مسائل کو زیادہ تفصیل سے اٹھایا ہے۔ اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا ہے اور عقد بیوگان کی پرزور حمایت بھی کی ہے مگر بیوہ کی شادی نہیں کرائی ہے۔ اس کی وجہ امرت رائے یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ آشرم میں پناہ لینے والی بیوہ سے شادی کرے گا تو لوگوں کو آشرم کے بارے میں غلط فہمی ہوگی اور بیوائیں آشرم میں آنے سے گھبرائیں گی اور جو لوگ اس آشرم کے خلاف ہیں ان کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔

پریم چند نے بیوہ کے مسئلے کو اپنی زیادہ تر ناولوں میں بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً 'جلوۂ ایثار' جس کی ہیروئین برجن ہے جس میں وہ اپنی بیوگی کو بھگتی کے سہارے گزارتی ہے اور باوجود اس کے کہ اس کا شوہر بہت خراب تھا اس کی یاد کو سینے سے لگائے رہتی ہے۔

گوشۂ عافیت میں بھی انھوں نے گائتری کے توسط سے بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ کس طرح وہ اپنی محرومی کو بھلانے کے لیے مذہب اور مصنوعی روحانیت میں پناہ لیتی ہے اور پھر اپنے بہنوئی کی چالاکیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ آخر کو اس کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔ پریم چند نے گائتری کے کردار میں یہ بات بہت خوبصورتی سے دکھائی ہے کہ وہ اپنے جنسی تقاضوں کو دبانے کے لیے کرشن بھگتی میں پناہ لیتی ہے جو عام طور پر ہندو بیوائیں کرتی تھیں۔ پریم چند نے گائتری کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''اسے صرف کرشن لیلا کے دیکھنے سے ہی تسکین نہ ملتی تھی بلکہ وہ خود بھی کوئی کوئی پارٹ کھیلنا چاہتی تھی۔''[1]

'غبن' میں بھی انھوں نے بیوہ کے مسئلے کا ذکر کیا ہے۔ 'میدانِ عمل' میں بھی انھوں نے بالواسطہ بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ منی جو ناول کے ہیرو امرکانت سے محبت کرتی ہے مگر اس محبت کا گلا اس لیے گھونٹ دیتی ہے کہ وہ بیوہ ہے، سماج میں ایک بیوہ کی شادی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پریم چند منی کی جنسی ناآسودگی اور گھٹن کی عکاسی بہت خوبی سے کرتے ہیں: ''امرکانت کا ذرا سا التفات بھی اسے سرشار کر دیتا ہے۔ اس کے ارمانوں کی نورس

---

[1] گوشۂ عافیت حصہ دوم ڈائمنڈ پاکٹ بکس دہلی، ص ۴۵۱

کلیاں کھل جاتی ہیں لیکن وہ بیوہ ہے اور جانتی ہے کہ امر اس کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تلخ احساس اسے آگے بڑھنے سے روک لیتا ہے۔''[1]

پریم چند نے گئودان میں بھی بیوہ کے مسئلے کو لیا ہے۔ اس میں انھوں نے نچلے طبقے کی بیوہ کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ جھنیا بیوہ عورت ہے جس سے ہیرو کا بیٹا گوبر بیوہ سے شادی کر لیتا ہے۔ مگر ماں باپ سے ڈر کر اس کو ان کے پاس چھوڑ کر شہر بھاگ جاتا ہے۔ پہلے تو ماں باپ برادری کے ڈر سے اس کو اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مگر پھر اس کی منت سماجت پر پگھل کر اس کو اپنی بہو مان لیتے ہیں اور اس کی سزا برادری کے بائیکاٹ کی صورت میں بھگتتے ہیں۔ ہوری جو اس ناول کا بوڑھا ہیرو ہے اور اس سے بھی زیادہ اس کی جرأت مند بیوی دھنیا اپنی بہو کے حقوق کے لیے برادری سے لڑتی ہے۔ گاؤں کا پنڈت داتا دین جھنیا کو اپنے گھر میں پناہ دینے پر کہتا ہے۔ ''تمہیں اس پاپن کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے تھا۔ دودھ میں مکھی پڑ جاتی ہے تو آدمی نکال کر پھینک دیتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے۔ سوچو کتنی بدنامی اور جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ کلچھنی گھر میں رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اس پر دھنیا جواب دیتی ہے، ہم کو مریاوا اتنی پیاری نہیں مہراج کہ اس کے پیچھے ایک جیو کی ہتھیا کر ڈالتے۔ بیاہتا نہ سہی پر اس کی بانہہ پکڑی ہے میرے بیٹے نے۔''[2]

فسانۂ خورشیدی افضل الدین[3] میں بیوہ کی دوسری شادی کی حمایت ہے۔ اس کا اصل موضوع تو عورتوں کی تعلیم ہے مگر ایک ضمنی کردار مشتری جو کمسنی میں بیوہ ہو گئی تھی، اس کا نکاح بھی نواب صاحب سے بہت کوششوں سے ہو جاتا ہے۔

حاجی محمد احسن وحشی بلگرامی نے اپنی ناول 'اشک حسرت' میں بھی بیوہ عورتوں کی عقد کی حمایت کی اور اس کے مخالف نظریوں کو بیان کر کے اس کے جواب دیے ہیں کہ بیوہ عورتوں کو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا ان پر سخت ظلم ہے۔

ایک بات قابلِ لحاظ ہے کہ خواتین ناول نگاروں نے اس مسئلے کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں بہ حیثیت عورت کے اپنی دماغی

---

[1] پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ۔ قمر رئیس، ص ۳۰۳

[2] بیوہ،... پریم چند... ص ۱۰۴

[3] فسانۂ خورشیدی، سن ندارد

Conditioning کی وجہ سے بیوہ کی شادی کے حق میں نہیں تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان خواتین نے زیادہ تر مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے اور اس میں بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی مگر اس کی حالت اتنی زبوں بھی نہیں تھی۔ ہندوستان سماج میں مسلمان بیوہ پر بھی اس قسم کی پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ مگر پھر بھی اس پر اتنی سختیاں نہیں تھیں۔ ویسے اس کی دوسری محرومیاں ہوں مگر مشترکہ خاندان میں وہ عام طور پر عزت سے زندگی گزارتی تھیں۔ پھر چونکہ اسلام میں یتیم مسکینوں کی مدد کا حکم بھی ہے اس لیے بھی معاشرہ کسی نہ کسی حد تک ان کی مدد کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی بیوہ کی حالت میں سدھار آیا ہے۔ بیوہ کی شادی کا رواج عام نہ سہی مگر اب اس قدر معیوب بھی نہیں ہے اور بیوہ پر جو پابندیاں تھیں ان میں تو نمایاں طور پر کمی آئی ہے۔ اس کے لیے سفید کپڑے، چوڑیاں، بناؤ سنگھار برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ تقریبوں میں بھی شامل ہوتی اور اس کا سایہ اب منحوس نہیں سمجھا جاتا مگر اس سے انکار بھی نہیں ہے کہ شادی کے موقعوں پر 'سات سہاگنوں' کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔ بیوہ خواتین خموشی سے ادھر ادھر ہو جاتی ہیں مگر یہی غنیمت ہے کہ ان کو وہاں سے ڈھکیلا نہیں جاتا ہے۔

(ج) طوائف کا مسئلہ

طوائف کا مسئلہ بھی اردو ناول نگاروں کے یہاں ہمیں شروع سے ہی ملتا ہے اور اس کی ابتداء بھی نذیر احمد اپنی ناول فسانہ مبتلا یا محصنات میں کرتے ہیں۔ ہریالی کو انھوں نے پیشہ ور طوائف نہیں خانگی بتایا ہے جو بظاہر گھر میں شریف عورت کی طرح رہ کر عصمت کا سودا کرتی ہے۔ اس کا سلسلہ بھی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی معاشی بدحالی سے ملتا ہے۔ انھوں نے اس کو ایک اچھی عورت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کی عورتوں کی وکالت بھی کی ہے۔ ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی مذمت بھی کی ہے۔ اور بقول صلاح الدین احمد: ''محصنات اردو کا پہلا ناول ہے جس میں طوائف کا کردار ایسی خوبی سچائی اور بے باکی سے پیش کیا ہے کہ زمانے کے ماحول کے لحاظ سے مصنف کی جرأت پر تعجب آمیز مسرت ہوتی ہے۔ یہ ناول مولوی صاحب نے تعداد ازدواج کی مخالفت میں لکھا مگر نادانستہ طور پر طوائف کو بطور بیوی اور سوکن کے اس مہارت اور چابک دستی سے ابھارا کہ آنے والی نسلیں ان کی فنکاری کو اپنے سامنے نمونے کے طور پر رکھیں گی۔ بلا کا لکھنے والا مولوی تھا یا حسن کا ریا زاہد شب زندہ دار یا رند شاہد باز۔''[1]

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ نذیر احمد نے ہریالی جو ایک طوائف ہے اس کی حسن و خوبصورتی کو زیادہ نہیں ابھارا ہے بلکہ اس کی تہذیب وشائستگی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے برعکس غیرت بیگم کو خوبصورت دکھایا ہے۔ ہریالی ایک سلیقہ مند شوہر پرست اور خدمت گزار عورت ہے اور اس میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ایک شریف گھرانے کی عورتوں میں ہوتی ہے بلکہ وہ مبتلا کے بچوں سے بھی محبت کرتی ہے۔ ان کی خدمت کرتی ہے اور اس طرح ''یہ بازاری عورت ہوتے ہوئے بھی اچھی گرہست عورت ثابت ہوتی ہے۔''[2]

اس میں مولوی نذیر احمد یہ دکھاتے ہیں کہ ایک شریف گھر میں پلنے والی عورت جاہل پھوہڑ بدزبان اور مغرور ہو تو چاہے وہ کتنی خوبصورت ہو شوہر کے لیے قابل اعتنا نہیں ہے

---

[1] ادبی دنیا، اردو ناول میں طوائف کا کردار، مارچ ۱۹۴۶ء، جلد ۲۴ نمبر ۳، ص ۳۲۔۳۳ بحوالہ نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار

[2] مقدمہ فسانہ مبتلا، بحواہ نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، افتخار احمد صدیقی

بلکہ اس کو سلیقہ مند کارگزار بیوی ہونا چاہیے۔ ہریالی کی طرف مبتلا راغب ہی اس لیے ہوتا ہے کہ غیرت بیگم سے اسے وہ کچھ نہیں ملتا جو ہریالی دے دیتی ہے۔ پھر خوبیاں کسی کی میراث نہیں ہیں ہر انسان اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور جو ماحول تھا اور ان کے سامنے جو اصلاح کا مشن تھا ان سب باتوں کی وجہ سے وہ ہریالی کو ایک ٹپیکل طوائف دکھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو صرف مرد کے پیشے سے تعلق رکھتی ہے اور آخر میں اس نظریے کی بناء پر شریف ہوتا ہے، رذیل رذیل۔ ہریائی اپنے شوہر کی موت کے بعد اس کا مال واسباب لے کر بھاگ جاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے معاشرے سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اسے مبتلا کی جائز بیوی مانے گا اور اس کے مال واسباب کا حق سمجھے گا۔ اس کے باوجود جیسا کہ قمر رئیس نے کہا ہے: ''ہریالی کے کردار میں پہلی بار اردو میں ایک طوائف اور اس کی زندگی اور نفسیات کا گہرا مطالعہ سامنے آتا ہے۔ طوائف ہو کر جو اس کے دل میں انسانیت ہے شوہر پرستی اور وفا شعاری کا جو احساس ہے، وہ غیرت بیگم کی خودداری، تنگدلی، حسد اور بے مہری کے مقابلے میں قاری کو شدت سے متأثر کرتا ہے۔''[1] اور وہ طوائف کے لیے اس طرح کی نفرت محسوس نہیں کرتا جو عام طور پر ناولوں میں طوائف کے کرداروں سے محسوس کرتا ہے۔

سرشار نے بھی اپنی ناولوں میں طوائفوں کا ذکر کیا ہے مگر اس طرح کہ لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب میں طوائفوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ طوائفوں کے مجرے ہوتے تھے۔ شرفاٗ طوائف کے کوٹھے پر جاتے تھے۔ ان کی ناول 'جامِ سرشار' میں ظہورن ایک ٹپیکل طوائف ہے جو لکھنؤ کے نواب کو ناز وادا غمزے عشووں میں رجھاتی ہے اور وہ اس سے نکاح کر کے الگ گھر میں رکھتے ہیں۔ مگر جب نواب کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے تو ظہورن یہ کہہ کر ان کے گھر سے کوٹھے پر چلی جاتی ہے۔ ''ہم تم پر کچھ گرے پڑے نہیں ہیں۔ ہماری اٹھتی جوانی اور جوبن کو خدا سلامت رکھے۔ تم سے ستر ہماری خوشامد کریں گے۔ تم ہم کو چھوڑ دو گے تو ہم بھی تم جیسے تین سو ساٹھ کو چھوڑ دیں گے۔ یہ ڈر ہو گا گھر کی جورو کو۔''[2]

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار سرسید بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۹

[2] اردو ادب کو خواتین کی دین۔ ارباب نشاط اور اردو ناول، خالد اشرف۔ ص ۱۳۶

سرشار طوائفوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر ان کا رویہ ہمدردی کا نہیں ہے، نہ اس کو وہ کوئی عورت کا مسئلہ سمجھتے ہیں بلکہ فسانۂ آزاد میں ان کی ہمدردیاں شریف زادیوں کے ساتھ ہیں جن کے میاں ان کو چھوڑ کر طوائفوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

۱۸۸۴ء میں سجاد حسین انجم کسمنڈوی کا ناول 'نشتر' پہلا ناول ہے جس میں طوائف کی طرف سے ہمدردی کا رویہ ملتا ہے ہیروئن طوائف ہونے کے باوجود جب حسن شاہ جو ایک شریف نیک نوجوان ہے اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور انگریز افسر سے خود کو بچا بچا کر رکھتی ہے۔ دونوں خفیہ طور پر نکاح کر لیتے ہیں مگر حسن شاہ اپنی نوکری کے سلسلے میں بچھڑ جاتا ہے اور وہ اس کی یاد میں گھل گھل کر ختم ہو جاتی ہے۔

قاری سرفراز حسین عزمی نے طوائفوں کو موضوع بنا کر دس ناول لکھے ہیں اور ان ناولوں میں انھوں نے طوائفوں کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں بعض میں انھوں نے طوائفوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے جو نوجوان شریف زادیوں کی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ جیسے 'سعید' اور 'سعادت' کا موضوع دہلی کی ایک خوبصورت تعلیم یافتہ طوائف ہے۔ اس کی زندگی کی دردبھری داستان ہے۔ 'خمار عیش' میں طوائف کی جوانی ڈھلنے کی داستان ہے۔ 'سرابِ عیش' کا موصوع ایک نائکہ ہے جو ناتجربہ کار نوعمر طوائفوں کو اس پیشے میں طاق کرتی ہے۔ 'سزائے عیش' میں عیاش نوجوانوں کی دردبھری داستان ہے کہ طوائفوں کے چکر میں پھنس کر وہ اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔ ان کی ان ناولوں میں 'شاہدِ رعنا' سب سے بہتر ناول ہے جس میں ان کا رویہ طوائف سے ہمدردانہ ہے اور اس کے پس منظر میں انھوں نے طوائف کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ اس کی ہیروئین ننھی جان طوائف ہے جو ایک عورت کی طرح سچے پیار اور باعزت زندگی گزارنے کی متمنی ہے۔ وقتی دلچسپی لینے والوں سے وہ محبت کرنے لگتی ہے مگر اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک طوائف ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اپنے وقتی عاشقوں سے پیار جتا کر زیادہ سے زیادہ ان کو لوٹے۔ ننھی جان اس کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے اندر برابر کسی ایک کے ہو رہنے کی خواہش پنپتی ہے۔ وہ دوسری طوائفوں کے نکاح کراتی ہے۔ خود اپنی لڑکی کی شادی کرتی ہے۔ توبہ کر کے مرزا صاحب سے نکاح کرتی ہے، حج کرتی ہے اور شادی کے بعد وہ اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ وہ اس پیشے سے کمائے ہوئے روپیہ سے ایسا محتاج خانہ کھلوانا چاہتی ہے جس میں

طوائف کے بچوں کی پرورش ہو۔ اس طرح 'شاہد رعنا' میں پہلی مرتبہ طوائف کے مسئلوں کو ہمدردی اور سنجیدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ویسے مجموعی طور پر قاری سرفراز حسین عزمی کے ناولوں میں یہ پیام ملتا ہے کہ جو عورتیں اس پیشے میں ہیں ان سے نکاح کر کے یا ان کو شریفانہ زندگی گزارنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے ان کو مذہب کی طرف راغب دکھایا گیا ہے اور ان کو تائب ہونے کا پیام دیا اور ان عورتوں کو جو اس پیشے میں ہیں ان کا استحصال نہیں کرنا چاہیے۔ ان ہی لائنوں پر مرزا رسوا نے زیادہ فنکارانہ انداز میں 'امراؤ جان ادا' میں طوائف کے مسئلے کو پیش کیا ہے اور یہ بات ابھر آئی ہے کہ سماج عورت کو طوائف تو بنا دیتا ہے مگر وہ اس زندگی سے اگر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ امراؤ جان ایک ایسی طوائف ہے جو خاندانی دشمنی کے سبب اغوا ہو کر طوائف کے کوٹھے پر پہنچتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی طوائف بن جاتی ہے۔ وہ اس سے وقتی طور پر خوش بھی ہوتی ہے مگر پوری طرح مطمئن نہیں ہوتی اور برابر اس کے ذہن میں کسی کی بیوی بن کر زندگی گزارنے کا خیال کچوکے لگا تا رہتا ہے۔'' امراؤ جان ادا میں رسوا نے سماج اور طوائف کے باہمی رشتے کا جائزہ لیا ہے۔''[1]

انھوں نے اس ناول میں یہ دکھایا ہے کہ طوائف اسی زمانے کی سوسائٹی کا ایک لازمی حصہ تھی۔ اس میں نوابین، جاگیرداروں، تعلق داروں، راجہ مہاراجاؤں کی تخصیص نہیں تھی۔ مذہبی لوگ بھی ان کے در پر جبہ سائی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس ناول میں یہ دکھایا ہے کہ طوائفیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو خاندانی طوائفیں ہیں، ایک وہ جنھیں حالات نے زبردستی کوٹھے پر لا کر بٹھا دیا ہے۔ رسوا کا رویہ طوائف کی پہلی قسم کی طرف اپنے پیش روؤں کی طرح حقارت کا ہے مگر طوائف کی دوسری قسم سے ان کو سخت ہمدردی ہے:

'' جو بدکاری کو برا سمجھتی ہیں اگرچہ ان کی حالت انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔''[2]

'' ان میں کوئی بات رنڈی پنے کی نہیں ہے، وہ اس پیشے کو ذلیل سمجھتی ہیں۔''[3]

رسوا کا خیال ہے کہ یہ عورتیں اگر اسی پیشے میں نہ ڈھکیلی جاتیں تو وہ کسی کی بیوی بن کر

---

[1] اردو ناول میں عورت کا تصور (نذیر احمد سے پریم چند تک) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ۱۹۹۲ء، ص ۸۰

[2] امراؤ جان ادا، بھاگو اسکول بک ڈپو ۱۹۴۸ء، ص ۱۰۴

[3] امراؤ جان ادا، بھاگو اسکول بک ڈپو ۱۹۴۸ء، ص ۱۸۳

گھر گرہستی سنبھالتیں۔ماں بنتیں۔

پریم چند نے طوائف کے مسئلے کو اپنی ناول 'بازارِ حسن' میں بھی پیش کیا ہے اور طوائف کے مسئلے کو ہندوستان میں عورت کی کمتر سماجی حیثیت سے جوڑا ہے۔مثلاً جہیز کی رسم، کم عمری کی شادی، بے جوڑ شادی اور ان کا نتیجہ عورت کے لیے طوائف کا کوٹھا۔سمن جو بازارِ حسن کی ہیروئین ہے وہ اپنے پڑوس میں رہنے والی طوائف کی زندگی، اس کے ٹھاٹ باٹ اور مردوں کا اس سے محبت کرنا، تحفے تحائف دینا دیکھ کر اپنی روکھی سوکھی زندگی کا موازنہ کرتی ہے جہاں بوڑھا، بدمزاج شکی شوہر دن رات اس پر سختیاں کرتا ہے۔وہ وقتی طور پر اس سے نجات حاصل کرنے کو اس طوائف سے ملنے لگتی ہے جس پر اس کا بدگمان شوہر اس کی عصمت پر شک کرتا ہے اور گھر سے نکال دیتا ہے۔وہ اپنی سہیلی سبھدرا کے گھر پناہ لیتی ہے۔وہاں بھی لوگ اسے بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ سہیلی کے میاں سے اس کے تعلقات ہیں۔ وہ گھبرا کر اپنی دوست بھولی طوائف کے گھر پناہ لیتی ہے اور طوائف بن جاتی ہے۔اس طرح پریم چند نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سماج خود عورت کو 'بازارِ حسن' میں پہنچا دیتا ہے اور پھر اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔سمن کو بازارِ حسن میں جا کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھولی بھی اپنی خوشی سے طوائف نہیں بنی۔اس کی کہانی بھی سمن کی طرح یہی تھی کہ اس کی شادی بھی ایک بوڑھے سے کر دی گئی تھی۔

شرما جی کو اس طرح سمن کا 'بازارِ حسن' کی زینت بننے سے جرم کا احساس ہوتا ہے اور وہ پہلے تو سمن کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر طوائفوں کی اصلاح کی تحریک چلاتے ہیں۔ان کے لیے ایک آشرم سیوا سدن کھولتے ہیں۔اس ناول میں پریم چند یہ مسئلہ بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر طوائفیں سماج کا ایک لازمی جزو ہیں تو کم از کم ان کے کوٹھے شہر کی آبادی سے دور ہوں تاکہ شریف عورتیں ان کی زندگی کی چمک دمک دیکھ کر گمراہ نہ ہوں۔نوجوان بدراہ نہ ہو۔''جہاں کتب خانے اور اخلاقی تحریکات کے مرکز ہونا چاہئیں وہاں ہم حسن کا بازار سجاتے ہیں۔''[1]

اس ناول میں پریم چند نے کبھی سمن اور کبھی بھولی کے ذریعے ہندوستانی سماج کے دہرے معیاروں پر سخت چوٹیں کی ہیں جن میں طوائف سے لطف اندوز ہونا مرد کا حق ہے

---

[1] بازارِ حسن، حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۴ء ص ۱۲۶

اور پھر اس سے نفرت کرنا اور اس کو گری ہوئی مخلوق سمجھنا اس کا شیوہ۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ زیادہ عورتیں طوائفیں اس لیے بنتی ہیں کہ وہ طرح طرح کی فرسودہ رسموں کی شکار ہیں۔ ان پر معاشرے کا جبر ہے۔ بقول ڈاکٹر رام بلاس شرما: ''پریم چند دکھاتے ہیں کہ عورت کی غلامی اور طوائفیت ہندو اور مسلمانوں دونوں میں ہے۔ وہ اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کا ڈنکا بجانے والوں سے کہتے ہیں، یہ ہے تمھاری تہذیب جو ہندو اور مسلمان دونوں ہی مذہبوں کی عورتوں سے طوائف کا کام کراتی ہے۔''[1]

شرما جی سمن کی سہیلی کے میاں ہیں جن کے گھر شوہر کے گھر سے نکال دینے پر اس نے پناہ لی تھی۔ یہ سن کر کہ سمن اب طوائف بن گئی ہے تو ان پر یہ ردِّ عمل ہوتا ہے: ''اس وقت ان کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔؟ ان کا فیصلہ گزشتہ واقعات کا تبصرہ کر رہا تھا۔ اگر میں نے اسے گھر سے نہ نکال دیا ہوتا تو وہ یوں تباہ نہ ہوتی۔ میرے گھر سے نکل کر اسے کہیں ٹھکانہ نہ ملا تو کچھ غم کچھ غصے کی حالت میں وہ خود فروشی پر آمادہ ہوئی۔ اس کا الزام میری گردن پر ہے۔'[2] اور وہ اس پر بس نہیں کرتا بلکہ بٹھل داس ''جو اس شہر کے قومی مشاغل اور تحریکوں کے روح تھے''[3] ان کو اس مسئلے کی طرف متوجہ کیا اور جو سمن کو اس ذلیل پیشے کو چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں تو سمن ان سے سوال کرتی ہے کہ ''اگر وہ یہ پیشہ نہ کرے تو کیا کرے۔'' میں گانے میں ہوشیار ہوں، میں گانا سکھانے کی پیش کش کر سکتی ہوں۔

بٹھل داس: ایسا تو یہاں کوئی مدرسۂ نسواں نہیں۔

سمن: میں نے کچھ تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے۔ لڑکیوں کو اچھی طرح پڑھا بھی سکتی ہوں۔

بٹھل داس نے اندازِ تفکر سے جواب دیا، لڑکیوں کے مدرسے تو کئی ہیں، پر تمھیں وہاں جگہ مل سکے گی۔ اس میں شک ہے سمن۔ تو پھر آپ مجھ سے کیا کرنے کو کہتے ہیں؟ ہے کوئی ایسا ہندو قوم کا رفیق جو میری گزران کے لیے پچاس روپے ماہوار دینا منظور کرے۔''[4] اور اس کا حل

---

[1] پریم چند اور ان کا یگ (ہندی) رام بلاس شرما ص ۳۱ بحوالہ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ شمیم نکہت، ص ۱۹۰

[2] بازارِ حسن، ص ۸۵

[3] بازارِ حسن، ص ۸۵

[4] بازارِ حسن، ص ۸۶

بٹھل داس یہ نکالتے ہیں کہ سمن کو ایک بدھوا آشرم میں بیوہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ مگر سمن کا مسئلہ یہاں بھی حل نہیں ہوتا۔ اس کی بہن شانتا کی شادی اس کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ باپ خودکشی کر لیتا ہے اور آشرم میں بھی اس کی مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے یہ بھی دکھایا ہے کہ طوائف کے کوٹھوں کی ظاہری چمک دمک اور طوائفوں کی زندگی پر رشک کرنے والی سمن جب وہاں طوائف بن کر پہنچتی ہے تو اسے وہاں کی محروم گھناؤنی زندگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس زندگی کو جلدی ہی چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ پریم چند سمن کے شوہر سے بھی اپنی غلطی کا پرائشچت کراتے ہیں کہ وہ طوائفوں کا آشرم چلا رہے ہیں جس میں سمن جا کر کام کرتی ہے۔ پریم چند نے اپنے پیش روؤں سے زیادہ وسیع کینوس پر طوائف کے مسئلے کو اٹھایا ہے اور اس ادارے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور اس کا حل بھی اس زمانے کے حالات کے پیش نظر کیا ہے۔ اس میں موجِ تہہ نشیں کی طرح یہ بات بھی مضمر ہے کہ عورت ایک بے جان، بے حس مخلوق نہیں ہے۔ کبھی وہ سماج میں اپنی پست حالت سے بغاوت بھی کر سکتی ہے اور طوائف بننا بھی بظاہر سماج سے اس کی بغاوت ہے۔

پریم چند نے 'غبن' میں بھی ضمنی طور پر طوائف کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ زہرہ نامی طوائف مجبوراً طوائف ہے مگر شریف گھر والی جالپا کی صحبت میں رہ کر اور ایک مردِ رما ناتھ کے خلوص اور محبت سے متأثر ہو کر تائب ہو جاتی ہے۔

'لیلیٰ کے خطوط' میں قاضی عبدالغفار نے بھی طوائف کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں ایک طوائف کی نفسیاتی، جذباتی حالت اور مردوں کی ہوس، بیوفائی اور ناانصافی کو نہایت تلخ انداز میں بیان کیا ہے۔ بقول خود قاضی صاحب: ''اپنی مختصر داستان میں وہ اپنی لاکھوں بدنصیب بہنوں کی روداد زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مردو کی نفس پرستی پر قربان کی جاتی ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا ہر نقش فریادی ہے۔''[1] لیلیٰ کے خطوط میں مصنف نے ایک طوائف کی زبانی مردوں کے غیر منصفانہ رویوں اور دوہرے معیار پر گہرا طنز کیا ہے۔ مذہب کے ٹھیکے داروں اور سماج کے سفید پوشوں پر چوٹ کی ہے، جن کے ہاتھوں عورت کی یہ درگت بنتی ہے۔ اس سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان میں سب سے زیادہ سخت الفاظ میں قاضی عبدالغفار نے سماج کے ان حالات کی مذمت کی ہے جس کے نتیجے میں عورت کو اپنی عصمت کا سودا کرنا پڑتا ہے۔

لیلیٰ مردوں کے بارے میں کہتی ہے کہ مردوں کا خیال ہے کہ: ''عورتیں احمق ہوتی ہیں،

---

[1] لیلیٰ کے خطوط، ادارۂ ادبیات لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۸

ناقص العقل ہوتی ہیں، فطرتاً مرد سے کمتر ہیں۔ آج میں بالائے بام کھڑی ہو کر پکارتی ہوں، بر سر بازار پکارتی ہوں کہ ہمارے وہ محافظ و نگراں کہاں ہیں۔ مسجدوں میں ڈھونڈوں یا مندروں میں۔"[1] یہی نہیں لیلیٰ دوسری جگہ اس سے بھی سخت الفاظ میں معاشرے میں عورت کے ساتھ ہوئی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مذہبوں کے اقوال کا سہارا لے کر: "کس طرح گزشتہ پانچ ہزار برس میں خدا کی مخلوق کے نصف حصے کو دوسرے نصف نے اپنا غلام بنایا، مٹایا، شمار سے باہر کر دیا۔ مرد اپنے کو خدا کی تصویر اور عورت کو شیطان کے آنے کا راستہ سمجھتا ہے۔"[2]

آخر میں وہ بھی لیلیٰ کی شادی ایک شریف سچی محبت کرنے والے انسان سے کراتے ہیں اور جسے لیلیٰ بہت منت سماجت کے بعد قبول کرتی ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کو ایک طوائف کو اپنی بیوی بنا کر سماج میں باعزت بنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا لہجہ طوائف سے ہمدردی اور رحم کا نہیں ہے بلکہ سماج سے انصاف مانگنے والی باغی عورت کا ہے جو اپنا حق مردوں کی بنائی ہوئی دنیا سے مانگ رہی ہے۔ ناولوں میں طوائف کا کردار اب تک گھر کو تباہ کرنے والی ویمپ کا ہوتا تھا جو اپنے ناز و انداز سے شریف باعزت عورتوں کے شوہروں کو ان سے چھین لیتی تھی۔ مرد اس سے کوٹھوں پر جا کر دل بہلاتے یا پھر ان کو اپنی مسٹریس یا رکھیل بنا لیتے۔ اس طرح قاری کی ساری ہمدردی ان نیک بیویوں سے ہوتی تھی مگر طوائف سے نہیں۔ سب سے پہلے رسوا پھر پریم چند اور آخر میں قاضی عبدالغفار نے اس تصور کو بالکل بدل دیا اور انھوں نے طوائف کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ناول نگاروں نے طوائف کے مسئلے کو اپنی ناولوں میں ابتداء سے ہی جگہ دی ہے اور اپنے انداز میں اس مسئلے کا حل بھی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ 'طوائف' کے ڈانڈے عورت کی کمتر حیثیت سے ملتے ہیں۔ اس تصور سے ملتے ہیں کہ عورت ایک کموڈٹی ہے۔ مرد کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ وہی اسے اپنے مفاد کے لیے گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتا ہے۔ تقدس کی چادر اوڑھا کر باہر کی دنیا سے کاٹ دیتا ہے۔ اس کو گھر کی باعزت بیوی، بیٹی، بہن کا درجہ دیتا ہے اور وہی اسے اپنی ضرورت اور فائدے کے لیے بازار میں بٹھا دیتا ہے اور اس سے لطف لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

---

1. لیلیٰ کے خطوط، ادارۂ ادبیات لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۶۹
2. لیلیٰ کے خطوط، ادارۂ ادبیات لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۱۹۷

تعدد ازدواج، بغیر مرضی اور بے جوڑ شادی، طلاق اور خلع

ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت نذیر احمد نے اپنی ناول فسانہ مبتلا یا محصنات میں بہت پرزور الفاظ میں کی ہے اور اس کا دردناک انجام بھی دکھایا ہے کہ کس طرح ایک متوسط طبقے کا نوعمر نوجوان اپنی بیوی سے اکتا کر ایک خانگی طوائف سے دوسری شادی کر لیتا ہے اور اسے طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں نذیر احمد نے اسلام کی رو سے چار شادیوں کی اجازت کی بھی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ حکم کیا ہے اور کن حالات کی وجہ سے ہے اور اس کے اصلی معنی کیا ہیں اور ضمناً انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ غیرت بیگم جو مبتلا کی بیوی تھیں ان کی جہالت، کج فہمی اور بدسلیقگی کی وجہ سے مبتلا کو دوسری شادی کرنا پڑی۔ پر انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ دوسری شادی سے عورتوں کو جو دکھ سہنے پڑتے ہیں، جو ناانصافیاں ہوتی ہیں مردوں کو بھی بہت پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ فسانۂ مبتلا کے دیباچے میں مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی میں دو بہت بڑے نقص ہیں۔''[1] ان کی دو ناولوں کا موضوع عورتوں کی جہالت تھا اور اس ناول میں انھوں نے مردوں کی دوسری شادی کے برے نتائج قصے کے پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ جب ناول کا ہیرو مبتلا دوسری شادی کا خیال ظاہر کرتا ہے تو دوسرا کردار عارف اس کی مخالفت کرتا ہے اور دونوں میں اس موضوع پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ مبتلا کہتا ہے کہ جب خدا نے چار شادیاں کرنے کا حکم دیا ہے تو کیوں نہ وہ اپنی پسند کی دوسری شادی کرے اور عارف کا کہنا تھا کہ شرع میں جن شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ شادی کرنے کا حکم ہے۔ اسے پورا کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال تو ہے ہی۔ وہ قرآن کی آیتوں کی پوری وضاحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عام طور پر اس مسئلے پر آدھی بات پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے لیکن اس کے آگے فرماتے ہیں: ''اگر تم کو یہ خوف ہو کہ متعدد بیویوں میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی کرو۔ اور اسی سورہ میں اسی بارے میں آگے چل کر

---

[1] دیباچہ فسانۂ مبتلا، الاشاعت، مسلم منزل دہلی، ۱۹۸۵ء ص ۹

کہا تم بہتیرا چاہو مگر تم سے یہ نہ ہو سکے گا کہ عورتوں میں برابر کر سکو۔''[1]

مگر مبتلا اس سے متفق نہیں ہوتا اور کہتا ہے کہ: ''مولوی محمد فقیہ نے اس مسئلے کی اچھی تحقیقات کی ہے۔''[2] اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے اور وہ شادی کر لیتا ہے اور اس نتیجے میں اس کو طرح طرح کی مصیبتوں، الجھنوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آخر کو اس کی موت ہو جاتی ہے۔

سرشار اس معاملے میں مردوں کی بے راہ روی پر فسانۂ آزاد میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے متعلق کہتے ہیں: ''یہاں کے رئیس زادے تو معاذ اللہ دو چار دس بیس پر بند نہیں دو گھر ڈال لیں چار کا ساتھ ہے تین نکاحی ہیں کوئی حد نہیں پھر بیسوائیں الگ۔''[3] دوسری جگہ فسانۂ آزاد کی ایک نسوانی کردار زینت النساء کہتی ہے: ''بڑی برائی یہ ہے کہ محض شیطان کے ورغلانے سے لوگ بیوی پر قادر نہیں رہتے۔ دو دو چار شادیاں کر لیتے ہیں۔ یہ رسم اہل اسلام میں بھی جاری ہے اور بعض اہل ہنود میں بھی مگر سو میں سے شاید ایک ایسا آدمی ہوتا ہوگا جو سب بیویوں سے عدل کر سکے۔ مرد وا چاہے فرشتہ بن کر کیوں نہ آئے ہم نہ مانیں گے کہ سب بیویوں سے اس کو مساوی محبت ہوگی۔''[4]

کشن پرشاد کول کے ناول 'شاما' میں ناول کی ہیروئین اس خیال کا اظہار کرتی ہے کہ: ''دھرم شاستر کی پرانی مریادا کو بالائے طاق رکھ کر قانون میں اس طرح ترمیم ہونی چاہیے۔''[5]

راشد الخیری نے بھی ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت کی ہے۔ وہ بھی اس بات کے حامی ہیں کہ مذہب نے مخصوص حالات اور کڑی شرائط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ انھوں نے جہاں اس رسم کو مردوں کی نفس پرستی پر محمول کیا ہے وہاں اس کی ذمہ داری بہت حد تک عورتوں پر بھی ڈالی ہے۔ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ مردوں کو دوسری شادی کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ ان کی ناول 'شب زندگی' میں وسیم دلہن ایسا ہی

---

1. فسانۂ مبتلا، ص ۱۴۹
2. فسانۂ مبتلا، ص ۱۴۲
3. فسانۂ آزاد جلد دوم (حصہ اول) ص ۳۴۱
4. فسانۂ آزاد جلد چہارم (حصہ اول) ص ۶۰۵
5. شیاما، بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۱۲۴

کردار ہیں جن کی اپنی تیز مزاجی، بدسلیقگی کی وجہ سے شوہر سے ناچاقی رہتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ: ''سوا چند خود غرض افراد کے جو شوقیہ نکاح کرتے ہیں...... عام طور پر نکاح ثانی کی وجہ موجودہ بیوی ہوتی ہے۔ اگر بیوی اپنے فرائض انجام دے اور پھر مرد دوسرا نکاح کرے تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوگا۔''[1]

یاسمینِ شام میں بھی ایک سے زیادہ شادی کے مسئلے کو لیا گیا ہے جس میں دوسری شادی کی وجہ عورتوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ اس میں مصنف نے ان والدین کی مذمت کی ہے جو شادی شدہ مردوں کو اپنی بٹی دے دیتے ہیں۔

پریم چند نے بھی اپنی ناول 'پردۂ مجاز' میں مردوں کی کئی شادیوں کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ وہ مرد کی ایک سے زیادہ شادی کے سخت خلاف ہیں۔ اس میں انھوں نے ایک کردار راجہ بشال سنگھ جن کی تین بیویاں موجود ہیں اور وہ چوتھی شادی منورما سے کر لیتے ہیں جو ایک پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہے اور اس طرح منورما کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ پہلے اس لیے کہ وہ شوہر کی چہیتی بیوی ہے باقی تین بیویوں کے طعنے سنتی ہے۔ پھر شوہر کی نظریں پھرتے ہی وہ محل سے نوکروں کی کوٹھری میں آ جاتی ہے۔ بشال سنگھ کی چہیتی بیوی جواب نئی بیوی منورما کے آنے کے بعد ان کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ ایک مقام پر کہتی ہے: ''مجھ میں اور بیوہ میں اب فرق کیا ہے، بلکہ بیوہ مجھ سے ہزار درجے اچھی، جلن تو نہیں یہاں تو زندگی رونے اور کڑھنے میں کٹ رہی ہے۔''[2]

عورت مرد کی کئی شادیوں کی صورت میں کس طرح محرومی کا شکار ہوتی ہے، پریم چند نے اس چیز کو خوبی سے اپنی ناول میں ابھارا ہے۔ اکبری بیگم نے 'گوڈر کے لال' میں اس طرح اس مسئلے کو اٹھایا ہے کہ معاشرے میں مرد تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور عورتیں جاہل اور بے تربیت ہیں جن سے ماں باپ زبردستی شادی کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تو مرد مجبور ہو کر جاہل بیوی کو قبول کر لیتے ہیں، مگر موقع ملتے ہی پھر روشن خیال پڑھی لکھی عورت سے شادی کر لیتے ہیں۔ ایک تو ان کا کہنا یہ ہے کہ لوگوں کو ایسے مردوں سے اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کرنا چاہیے جن کی بیویاں موجود ہوں اور اگر مجبوراً ایسا کرنا بھی

---

[1] شامِ زندگی، سلیمانی پریس بنارس، ۱۹۱۲ء، ص ۸۷

[2] پردۂ مجاز، لاجپت رائے این، سنز دہلی، ۱۹۴۱ء، ص ۱۴۳

پڑے تو ان پڑھی لکھی دوسری بیویوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی جاہل سوت سے اچھا سلوک کریں اور اس کے حقوق کی حفاظت کریں، اس کے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ مہر جبیں یوسف مرزا کی دوسری بیوی پڑھی لکھی تربیت یافتہ بیوی ہے اور لاعلمی میں اس کی شادی یوسف مرزا سے ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے حسن اخلاق اور سمجھ داری سے شوہر کا دل جیت لیتی ہے بلکہ اپنے میں اکی پہلی بیوی کا بھی خیال رکھتی ہے۔ میاں سے اس کی وکالت کرتی ہے اور بار بار میں اسے یہ اصرار کرتی ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے اچھا سلوک کرے۔ اگر وہ جاہل بدسلیقہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے جائز حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

ناول میں اس طرح نوٹ ہے: ''میری پیاری ناظرات! سنو آج کل کثرتِ ازدواج کا رواج ہو گیا ہے۔ ذرا سا بہانہ پکڑا اور دوسری شادی کر لی، بخلاف زمانۂ گزشتہ کے۔ پہلی بیوی کے ہوتے اپنی لڑکی دے دیتے ہیں۔ اس واسطے ان لڑکیوں کے جن کے ماں باپ یہ ظلم گوارا کریں کہ پہلی بچاری پر اپنی بیٹی دے دیں انھیں مہر جبیں اور خورشید جبیں سے سبق حاصل کر لینا چاہیے۔ اول الذکر نے اپنی سوت سے اور آخر الذکر نے اپنی بہن کی سوت سے کس طرح کا برتاؤ کیا، کاش ہماری تعلیم یافتہ بہنیں جنھیں سوت اور سوتیلے سے واسطہ پڑے ایسی ہی رحم دل اور انسان صفت اپنے کو ثابت کریں۔''[1]

اسی طرح محمد بشیر الدین کی ناول 'اقبال دلہن' کا موضوع بھی نکاحِ ثانی کے برے نتائج کا تفصیلی بیان ہے اور اس صورت میں انھوں نے ناول کے ہیرو کا دوسرا نکاح کرایا ہے کہ پہلی بیوی کی اولاد نہیں ہوتی ہے مگر یہ نکاح پہلی بیوی کی اجازت سے ہوتا ہے اور دونوں بیویاں ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے رہتی ہیں۔ ضیا بانو کی ناول 'فریبِ زندگی' کا موضوع بھی ایک سے زیادہ شادی کے برے نتائج ہیں۔ ناول کا ہیرو اپنی مالی حالت بہتر ہو جانے کے بعد ایک طوائف سے شادی کر لیتا ہے۔ اس شادی کا برا انجام ہوتا ہے اور پورے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

بیاضِ سحر (و۔ ب۔ سدید) میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ شادی کرنی بھی پڑے تو بیویوں میں مکمل اتفاق ہونا چاہیے۔ اس ناول میں ایک مشرقی اور ایک

---

[1] گودڑ کا لال، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ص ۲۳۰

مغربی اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق سے رہتی ہیں۔

نذر سجاد حیدر نے 'آہِ مظلوماں' میں کئی شادیوں کی شدید مخالفت کی ہے۔ اس سے اٹھنے والے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس پر زور دیا ہے کہ دو شادیاں اقتصادی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ اس ناول میں نذر سجاد حیدر دو قصے بیان کرتی ہیں۔ ایک میں میاں ایک طوائف سے شادی کر لیتے ہیں۔ دوسرے میں ماں بیٹے کی دوسری شادی کرا دیتی ہیں۔ مرد کی ایک سے زیادہ شادی سے عورتیں کن مصیبتوں سے گزرتی ہیں اس کو پر اثر انداز سے بیان کیا ہے اور ناول کے آخر میں مردوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں۔ اور عورتوں کی زندگی کو بہتر بنانے اور ان کے سلسلے میں اصلاحات کی بھی درخواست کی گئی ہے۔ ناول ان اشعار پر ختم ہوتی ہے۔

مبتلا جب ہم آفتوں میں ہیں
کس طرح تم کو راہبر جانیں
کثرتِ ازدواج جب دور ہو
تب تمہیں ہم ریفارمر جانیں

انھوں نے اپنی دوسری ناول نجمہ میں دوسری شادی کی مخالفت کی ہے۔ اپنی ایک ناول 'حرماں نصیب' میں بھی وہ ہیروئین کو ہیرو سے ملاتی ہیں تو وہ شادی شدہ ہوتا ہے۔ ہیروئین بجائے اس سے شادی کرنے کے اسے سمجھا بجھا کر دوسری بیوی کے پاس بھیج دیتی ہے۔ اس طرح مسئلے کا حل وہ یہ نہیں نکالتیں کہ مرد دو شادیاں کرے اور دونوں بیویاں اتفاق سے رہیں۔

اردو کے ناول نگاروں نے بے مرضی کی اور بے جوڑ شادی کو بھی شروع سے ہی موضوع بنایا ہے۔ جہاں تک بغیر مرضی کی شادی کا معاملہ ہے اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ شادی طے کرنے کا کام گھر کے بزرگ کرتے تھے۔ ان کی مرضی اور پسند پر شادیاں ہوا کرتی تھیں مگر مرد پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اپنی مرضی شامل کر لیتے تھے اور اگر زبردستی ان کی بے مرضی کی شادی ہو بھی جاتی تو پھر اپنی مرضی کی شادی کر لیتے۔ پھر امرا، رؤسا، راجا مہاراجاؤں، جاگیرداروں، تعلقدار کو معاشرہ اپنی پسند کی ایک شادی بلکہ کئی کئی شادیاں کرنے کی اجازت دے دیتا تھا مگر عورت کو شاید کے معاملے میں دم مارنے کی

اجازت نہ تھی۔

'ایامی' میں اس موضوع کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں: ''شادی بیاہ کے معاملے میں عورتوں کی درماندگی اس درجے کو پہنچی کہ ان میں اور افریقہ کے لونڈی غلاموں میں کچھ فرق نہیں، مالک نے جس کے ہاتھ چاہا لونڈی غلاموں کو بیچ دیا۔ اسی طرح ولی بزرگ یا سرپرست جس کے ساتھ جی میں آیا عورت کو بیاہ دیا۔''[1]

سرشار بھی شوہر کے انتخاب میں لڑکی کی مرضی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

''کنواری لڑکی سے زیادہ بے بس کون۔ کوئی نہیں۔ زبان ہے مگر بول نہیں سکتی۔ گویا منہ میں زبان نہیں ...... کیا مجال کہ لب سے جنبش کی اور لوگوں نے طعنہ دینا شروع کیا...... بڑی بوڑھی عورتیں طعنے دے دے کر ناک میں دم کر دیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ تمام عمر کس کے ساتھ بسر کرے گی۔ اس کے فرشتے کو بھی خبر نہیں کہ وہ کس کے ساتھ بیاہی جائے گی۔''[2]

اپنی ناول 'فسانۂ آزاد' کی ہیروئین حسن آرا کی زبانی وہ اس بات کو بہت وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ عورت کو اس کے شوہر کے پسند کی آزادی ہونی چاہیے۔ حسن آرا ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے لیکن اس کی ماں جاہل، توہم پرست، رسم و رواج کی پابند عورت ہے۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے: ''بڑی بیگم نے ایک رئیس باتوقیر کے صاحبزادے اکبر کے ساتھ اپنی بڑی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہا اور ان کے پیغام کو قبول کر لیا۔ بڑی لڑکی حسن آرا بچاری ششدر حیران و مضطر کہ یاالٰہی اب میں کیا کروں۔ جو میرے شوہر ہونے والے ہیں ان کی صورت کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ہم جولیاں مبارک سلامت کہتی ہیں۔ پلیوں خون خشک ہوا جاتا ہے، اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خدا جانے بدوضع ہے، بدقطع ہے، پڑھا لکھا ہے یا جاہل ناخواندہ۔ واللہ اعلم۔ خیالات کیسے ہیں، یاالٰہی کیا کروں کہاں جاؤں۔''[3]

حسن آرا کی خوش قسمتی سے وہ رئیس زادہ چوری کے جرم میں گرفتار ہو جاتا ہے اور یہ خبر یوں اخبار میں شائع ہوتی ہے: ''افسوس صد افسوس اس رئیس زادے کی شادی ایک

---

[1] ایامی، ص ۱۳۸

[2] فسانۂ آزاد، جلد دوم، دوسرا حصہ، ص ۹۷۱

[3] فسانۂ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بورڈ، ص ۴۶۵

تربیت یافتہ حسین رئیس زادی سے قرار پائی تھی۔ اس کا نام حسن آرا ہے۔'' [۱] یہ خبر جب حسن آرا کی ماں کو سنائی جاتی ہے تو وہ کہتی ہیں: ''چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔ حسن آرا میری طرف سے چھاتی سے لگاؤ اور کہہ دو کہ جو شریف زادہ تم کو پسند ہو اس کے ساتھ تمھارا نکاح کر دوں گی مگر پڑھا لکھا ہو، عالی خاندان ہو۔'' [۲]

اس کے بعد حسن آرا باقاعدہ میاں آزاد جو اس ناول کے ہیرو ہیں ان کا انٹرویو لیتی ہے۔ ان کو بتاتی ہے کہ اس کے ذہن میں شریک حیات کا کیا تصور ہے: ''جو میاں اور بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں تو خوب مزے میں کٹے۔ میں نے تو دل میں ٹھان لی ہے کہ عمر بھر بن بیاہی رہوں گی اگر شادی کروں گی تو کسی ایسے سے جو زیور علم و فضل سے متجلی ہو اور حسین بھی ضرور ہو...... لطف یہ ہے کہ میاں کتاب پڑھ رہے ہیں بیوی مزے سے سن رہی ہیں۔ بیوی نے پڑھا کبھی میاں کو سنایا۔'' [۳]

میاں آزاد جب اس پر پورے اترتے ہیں تب حسن آرا ان کو اپنا شریک زندگی بناتی ہے۔ سرشار کا کہنا ہے کہ: ''میاں بیوی کو ایک متعد بہ حصہ باہم صرف کرنا پڑتا ہے اگر نہ بنی یا پھوٹ ہو گئی یا چخ چلی یا شکر رنجی ہو گئی تو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔'' [۴] اس لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور شادی کے فیصلے میں دونوں کی مرضی شامل ہو۔ اس سلسلے میں سرشار نے جو تصور اپنی ناول میں پیش کیا ہے جو بہت ترقی پسندانہ ہے۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سرشار رئیسوں اور نوابوں کی زندگی پیش کر رہے تھے۔ ان کا موضوع متوسط طبقہ نہیں تھا جہاں پر عورتوں پر سخت پابندیاں تھیں اور وہ سماج کے غلط رسم و رسوم میں جکڑی ہوئی تھیں۔

شرر نے بھی اپنی ناولوں میں عورتوں کی اپنی پسند کی شادی کی پر زور حمایت کی ہے اور اس بات پر افسوس کیا ہے کہ احکامِ شرع کو نظر انداز کر کے رسم رواج پر عمل کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام میں شادی کے لیے فریقین کی رضامندی پہلی شرط ہے۔ انھوں نے

---

[۱] فسانہ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بورڈ، ص ۴۶۷

[۲] فسانہ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بورڈ، ص ۴۶۸

[۳] فسانہ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بورڈ، ص ۴۷۱

[۴] فسانہ آزاد، جلد اول، ترقی اردو بورڈ، ص ۳۲۲

یہ حق بھی دیا ہے کہ عورت اور مرد شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور جان لیں مگر جہالت اور رسم پرستی کی وجہ سے شادی میں لڑکے لڑکی اور خاص طور سے لڑکی کی مرضی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ شادی کا معاملہ مشاطاؤں پر چھوڑ دیا گیا ہے اور معاشرے میں کتنی ہی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں اور اس ناکامی کا بھگتان عورت کو خاص طور سے بھگتنا پڑتا ہے۔

'آغا صادق کی شادی' اور 'بدرالنساء' میں شرر نے اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے ناول آغا صادق کی شادی میں پہلے ہی صفحے پر لکھا ہے۔ ''ایک اوریجنل ناول جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ناواقفیت سے اکثر شادیوں میں کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔''[1]

آغا صادق بغیر دیکھے شادی کر کے نہایت پچھتاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اصل یہ ہے کہ سارا جھگڑا محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ میں نے حضرت رسالت مآب علیہ السلام کے اس حکم کی پرواہ نہ کی۔ عقد نکاح سے پہلے بی بی کی صورت دیکھ لینی چاہیے۔''[2]

اپنی ناول 'دلچسپ' میں بھی انھوں نے مرد کی ناپسند کی شادی کو موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں اس کا بھگتان عورت ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ شوہر باہر عیاشی بھی کرتے ہیں، دوسری شادی بھی کر لیتے ہیں اور بچاری عورت زندگی بھر شوہر کی ناپسندیدہ شادی کا تاوان دیتی ہے۔

راشد الخیری نے بھی عورت کی مرضی کی شادی کی حمایت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اپنی پسند اور مرضی کی شادی کرنا یہ نئے زمانے کی دین نہیں ہے نہ مغربی تہذیب کی بلکہ یہ حق تو عورتوں کو اسلام نے بہت پہلے دے دیا تھا۔ وہ والدین کے اس رویے کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ وہ لڑکی کے مرضی لیے بغیر بلکہ اکثر اس کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کر دیتے ہیں۔ 'صبح زندگی' میں کہتے ہیں: ''اس کی مجبوری اور بے بسی تو دیکھو جس کے سر چاہا چپیک دیا، جہاں چاہا پٹخ دیا۔''[3]

ان کی ناول 'سوکن کا جلاپا' کا موضوع بھی ایک طرح سے غلط شادی ہے۔ ایک

---

[1] آغا صادق کی شادی بحوالہ عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن، شرف احمد گوہر پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۶

[2] آغا صادق کی شادی بحوالہ عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن، شرف احمد گوہر پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۶

[3] صبح زندگی، سلیمانی پریس بنارس، ۱۹۱۲ء، ص ۲۱

شادی شدہ انسان سے کنواری لڑکی کی شادی اور پھر پہلی بیوی کی بدسلوکی اور ساس نندوں کی ظلم وستم کی داستان کا بیان ہے۔ 'سنجوگ' کا موضوع بھی دولت کے لالچ میں لڑکی کی غلط شادی اور اس کا برا انجام دکھایا گیا ہے۔

طیبہ بیگم خدیو جنگ نے اپنی ناول 'انوری بیگم' میں بھی پسند کی شادی کی حمایت کی ہے۔ ناول کا ہیرو سجاد اپنی بچپن کی منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور انوری بیگم جو پڑھی لکھی روشن خیال لڑکی ہے اس کی اور اپنی مرضی سے شادی کرتا ہے۔ محمدی بیگم کی ناول 'صفیہ بیگم' میں بھی دکھایا گیا ہے کہ ناول کی ہیروئین صفیہ کی منگنی اس وقت اس کے کزن سے کر دی جاتی ہے جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑے ہو کر صفیہ پڑھتی لکھتی سلیقہ شعار لڑکی نکلتی ہے۔ تصویریں بھی بناتی، گھریلو علاج بھی کرتی ہے اور اس کا منگیتر نہایت آوارہ نکلتا ہے اور اس کی شادی صفیہ کی مرضی کے بغیر اسی سے کر دی جاتی ہے۔ صفیہ کو اس شادی کا اتنا غم ہوتا ہے کہ وہ مر جاتی ہے اور مرنے سے پہلے ماں باپ کے نام ایک خط لکھتی ہے جس میں منگنی کے مضر نتائج پر روشنی ڈالتی ہے اور لڑکی کی بغیر مرضی کی شادی کی مذمت کرتی ہے اور تمام والدین کو لڑکیوں پر اس ظلم سے باز رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔

عباسی بیگم کی ناول 'زہرا بیگم' کی پڑھی لکھی زہرہ کی بے جوڑ شادی اس کی مرضی کے بغیر ایک جاہل نواب سے اس کی ماں کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ زہرہ کی دردناک موت ہوتی ہے۔

صغرا ہمایوں مرزا کی ناول 'سرگزشتِ ہاجرہ' میں جبری شادی کے نقصانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمد علی طبیب کی ناول 'اختر وحسینہ' میں بھی یہ بات بتائی گئی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی شادی ان کی مرضی کے بغیر ہو تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے اور یہ حق جو انھیں مذہب کی طرف سے بھی ملا ہے اس سے انھیں محروم کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

پریم چند نے بھی متعدد ناولوں میں عورتوں کی بغیر مرضی کی بے جوڑ شادی کی سخت مذمت کی ہے اور اس کے بھیانک نتائج دکھائے ہیں۔ یہ دکھایا ہے کہ اس طرح کی بے جوڑ شادیوں کا اس قدر بھیانک انجام ہوتا ہے۔ ان کی ناول جلوۂ ایثار میں برجن کی شادی بجائے پرتاب کے جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی ایک رئیس، بدچلن کملا چرن سے کر دی جاتی ہے اور جہاں وہ خدمت اور ایثار سے کام لے کر شوہر کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرتی

ہے مگر اسے زندگی کا سچا سکھ اور شادی شدہ زندگی کا اصلی سکھ نصیب نہیں ہوتا اور آخر کو کملا چرن اپنی عیاشیوں کے نتیجے میں مر جاتا ہے اور: ''برجن جو کملا چرن کی بے راہ روی کی وجہ سے پہلے ہی خوشیوں سے محروم تھی اپنی نوجوانی ہی میں بیوگی کا لباس پہن لیتی ہے۔ یہ عبرتناک انجام صرف بے جوڑ شادی کا نتیجہ ہے۔''[1]

بازارِ حسن میں بھی پریم چند نے اس مسئلے کو اسی طرح پیش کیا ہے کہ سمن کی بے جوڑ شادی کے نتیجے میں وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے غیر مطمئن ہو کر بھٹک جاتی ہے اور طوائف بن جاتی ہے۔ اس ناول میں بھولی بائی طوائف بھی اپنی ہی کہانی بیان کرتی ہے کہ اس کو کس طرح ایک بوڑھے سے بیاہ دیا گیا۔ وہ کہتی ہے: ''ہم کوئی بھیڑ بکری ہیں نہیں کہ ماں باپ جس کے گلے مڑھ دیں بس اسی کے ہو رہیں۔ یہ بیہودہ رواج ہمیں لوگوں میں ہے کہ عورتوں کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں۔ نہیں تو اور ملکوں میں عورت آزاد ہے۔ اپنی پسند سے شادی کرتی ہے۔ جب اسے راس نہیں آتی تو چھوڑ دیتی ہے لیکن ہم لوگ وہی پرانی لکیر پیٹتی چلی آ رہی ہیں۔''[2]

ان کی ایک ناول 'نرملا' کا موضوع بھی بے جوڑ شادی ہے۔ اس سے جڑا ہوا جہیز کا مسئلہ ہے اور بے جوڑ شادیوں کی وجہ ان کے نزدیک زیادہ جہیز کی رسم ہے۔ جہیز نہ فراہم کرنے کی صورت میں نرملا کے غریب ماں باپ اس کی بے جوڑ شادی کر دیتے ہیں اور وہ زندگی بھر طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہے اور اپنے شوہر کی شکی طبیعت کی وجہ سے نرملا کو دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پریم چند نے بہت اچھی طرح دو ایسے میاں بیوی کی کشمکش کو پیش کیا ہے جن میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ آخر وقت میں نرملا اپنی چھوٹی سی بچی کو اپنی نند کے سپرد کر کے کہتی ہے: ''چاہے کنواری رکھئے، چاہے زہر دے کر مار ڈالیے مگر نااہل کے گلے نہ باندھیئے گا۔ اتنی ہی آپ سے میری بنتی ہے۔''[3]

انھوں نے چوگانِ ہستی'' میں بھی بے جوڑ شادی کا مسئلہ اٹھایا۔ ایک لڑکی اندو جو اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور سبھاگی نچلے طبقے سے۔ یہ دونوں ہی طرح طرح کی

---

[1] پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار شمیم نکہت۔ نصرت پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۷۵ء، ص ۲۳۳

[2] بازار حسن۔ پریم چند، ص ۵۳

[3] نرملا، آزاد بک ڈپو، ص ۳۹

مشکلات اٹھاتی ہیں۔ جیسا کہ قمر رئیس نے کہا ہے کہ: ''بے میل شادی کا مسئلہ کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔''[1] بلکہ ہر طبقے میں اس طرح کی شادیاں ہوتی ہیں اور عورتیں دکھ اٹھاتی ہیں۔ 'میدانِ عمل' میں بھی پریم چند نے نینا اور منی رام کے سلسلے میں بے میل شادی کا مسئلہ اٹھایا ہے اور بتایا ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ منی رام اور نینا کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس کا اندازہ نینا کو پہلی رات ہی کو ہوتا ہے اور اس پر اس کا یہ ردِ عمل ہوتا ہے: ''جو آدمی صرف روپ کا بھوکا ہے جو صرف ناز و انداز کا غلام ہے، جس کے لیے عورت محض نفع کا ایک ذریعہ ہے اسے میں شوہر کیسے سمجھتی۔''[2]

اور اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف قومی تحریک میں حصہ لیتے ہوئے نینا اس کی گولی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ بے جوڑ شادی کا اس سے برا انجام اور کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے آخری نامکمل ناول 'منگل سوتر' میں بھی انھوں نے بے جوڑ شادی کے مسئلے کو لیا ہے اور یہاں بھی میاں کے خیالات میں شدید اختلافات دکھایا ہے۔

اکبری بیگم کی 'گودڑ کا لال' میں ثریا جبیں جو تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ وہ شادی کے موضوع پر کھل کر بات چیت کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ کس قسم کے شوہر کو پسند کرتی ہے۔ عباسی بیگم کی ناول 'زہرا بیگم' میں بے جوڑ شادی کے عبرتناک انجام کو موضوع بنایا گیا ہے جو اس کی جاہل اور رسم پرست ماں کی زبردستی کا نتیجہ تھی۔

نذر سجاد حیدر کی پہلی ناول 'اختر النساء' کی ہیروئین کی شادی اس کی مرضی کے بغیر طے کر دی جاتی ہے اور وہ شوہر اور سسرال والوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو جاتی ہے۔ نذر سجاد حیدر نے اپنی ناولوں میں براہِ راست لڑکی کی شادی میں اس کی مرضی اور مناسب موضوع شادی کی وکالت نہیں کی ہے مگر انھوں نے اپنی ناولوں میں جس قسم کی فضا دکھائی ہے اور جس طبقے کی عکاسی کی ہے اس میں خواتین گھٹے ہوئے ماحول کے بجائے بدلتے ہوئے معاشرے میں آزاد فضا میں سانس لیتی ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنی پسند کی شادی کرتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ طبقہ وہ اعلیٰ متوسط طبقہ تھا جس نے انگریزی تہذیب و

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۶۸، ص ۲۴۴

[2] میدانِ عمل، پریم چند مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، ۱۹۸۲، ص ۳۰۴

تمدن کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

حجاب امتیاز علی کی ناول 'ظالم محبت' میں بھی بچپن کی منگنی اور بغیر مرضی کی شادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہیروئین کی شادی چھ سال کی عمر میں اپنے چچازاد بھائی سے ہو جاتی ہے۔ اس کی خاندان کی بزرگ دادی زبیدہ نہایت سخت گیر اور خاندانی روایت کی پابند خاتون ہیں۔ گو اس میں جن لوگوں کی زندگی دکھائی گئی ہے، وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محلوں میں رہتے ہیں، جزیروں کی سیر کرتے ہیں مگر سماج کے غلط اصول ان کی زندگی میں بھی الجھنیں اور مشکلات کا سبب بنتے ہیں۔

اے آر خاتون کی ناول 'شمع'، 'تصویر' اور 'افشاں' میں بھی خاص طور سے شمع اور افشاں میں پرانے قدیم وضع کے گھرانوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ بچپن کی منگنیاں، ان کی وجہ سے آپس کی رقابتیں، پیچیدگیاں اور الجھنیں بیان کی گئی ہیں۔ بار بار اس پر زور ہے کہ شادی کے لیے لڑکی کی مرضی اور پسند ضروری ہے اور جاہل اور قدامت پرست لوگوں کو بغیر مرضی کی شادیوں کے فیصلے کرتے دکھایا گیا ہے اور ان کے خراب نتائج بھی دکھائے گئے ہیں۔

صالحہ عابد حسین کی ناول 'عذرا' میں بار بار مختلف طرح سے شادی میں لڑکے اور لڑکی کی مرضی کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کو لڑکی کا حق بتایا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا شریک حیات منتخب کرے۔

کشن پرشاد کول کی ناول 'شاما' میں بھی بے مرضی کی شادی اور اس کے خراب نتائج کو دکھایا گیا ہے کہ ہندو سماج میں عورت پر کس طرح کی سماجی اور مذہبی بندشیں ہیں اور غریب عورتیں ان بندشوں کی وجہ سے کن کن ناانصافیوں کا شکار ہوتی ہیں۔

نذیر احمد نے اپنی ناول 'فسانۂ مبتلا' میں اس مسئلے کو بھی اٹھایا ہے کہ اس کے باوجود کہ اسلام میں عورت کا باپ کے جائیداد میں حصہ ہے، مردوں نے اس کے اس حق کو بھی غصب کرلیا ہے۔ وہ مبتلا کی پہلی بیوی غیرت بیگم کو اس کے بھائی سے حصہ دلواتے ہیں اور قرآن و حدیث سے اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس طرح راشد الخیری نے بھی اپنی ناولوں میں اس مسئلے کو اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ طلاق اور خلع دونوں کے مسئلے کو ناول نگاروں نے اٹھایا ہے۔ کشن پرشاد کول نے اپنی ناول شاما کی ہیروئین سے خط کے ذریعے اپنے محبوب سے یہ کہلوایا ہے کہ اگر عورت کا اپنے شوہر سے نباہ نہ ہو تو اسے طلاق لینے کا حق ہونا چاہیے تاکہ وہ

اپنی پسند کے مرد سے شادی کر سکے۔

عزیز احمد نے 'گریز' میں عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا ہے، اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ تعلیم یافتہ نئے خیالات کا نوجوان ایک پڑھی لکھی فیشن ایبل سے شادی کر لیتا ہے۔ اس کو باہر کی دنیا سے روشناس کراتا ہے اور پھر اس پر شک کرتا ہے اور اس پر پابندیاں لگاتا ہے اور خود دوسری عورت سے دلچسپی لیتا ہے جس پر اس کی ماں اسے خلع لینے کا مشورہ دیتی ہے۔ دوسری ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں ہیروئین خلع لے لیتی ہے۔ عزیز احمد کے ناول 'مرمر اور خون' کا موضوع بھی عورت پر سماجی بندشیں اور قیود ہیں۔ یہاں انھوں نے خلع کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اسلام نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے مگر معاشرے نے اسے اس حق سے محروم کر دیا ہے۔

اردو ناولوں میں ابتداء سے ہی عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا گیا اور یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی کہ عورت سماج کا ایک اہم حصہ ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ عورت کی سماجی حیثیت بہتر ہو، وہ تعلیم یافتہ ہو اس کو اچھی تربیت دی جائے۔ جائز حقوق دیے جائیں اور اس کو مرد کی ملکیت نہ سمجھا جائے۔ نذیر احمد نے سب سے زیادہ اپنی ناولوں میں عورتوں کی سماجی اہمیت پر زور دیا اور متوسط طبقے کی مسلمان عورتوں کو موضوع بنایا اور ان کی بہتری کے نقشے اپنی ناولوں میں پیش کیے۔ ان کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ انھوں نے عورت کی تعلیم اور آزادی کا بہت محدود اور قدامت پرست تصور پیش کیا لیکن غور سے اگر دیکھا جائے اور جس زمانے میں انھوں نے یہ ناول لکھے اس وقت کی سماجی حالت کو نظر میں رکھا جائے، خاص مسلمان متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی کو جوان کے ناولوں کا موضوع ہے، ان پر یہ غلط الزام ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی ناول 'مراۃ العروس' میں اصغری کے مثبت اور اکبری کے منفی کردار کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانی زندگی میں عورت کا رول کس قدر اہم ہے۔ ایک پڑھی لکھی، سمجھدار، سلیقہ مند، ذہین عورت نہ صرف اپنے گھر کو سنبھال لیتی ہے بلکہ اس کے فیض سے محلے پڑوس کی اس کی ہم جنس عورتیں بھی سدھر جاتی ہیں۔ اس میں دکھایا ہے کہ اصغری اپنے میاں کو علم کا شوق دلاتی ہے۔ اس میں ہمت پیدا کرتی ہے۔: ''میاں کی اصلاح کے بعد اصغری سیالکوٹ سے اپنے سسر کے پاس جاتی ہے اور ضعیف العمر سسر کو آرام کا مشورہ دے کر پنشن کے لیے آمادہ کرتی ہے اور ان کی

جگہ اپنے بہنوئی محمد عاقل کو ملازمت دلواتی ہے۔''[1] نذیر احمد نے اصغری کو قومی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہوئے بھی دکھایا ہے اور اس طرح عورت کی اہمیت کو منوا لیتی ہے۔ اس کے بعد 'بنات النعش' ہو یا 'توبۃ النصوح'، 'فسانہ مبتلا' ہو یا 'ایامیٰ' سبھی ناولوں میں عورتوں کے حقوق، ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح دینے کی مذمت کی ہے۔ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اس سے نہ صرف لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے بلکہ لڑکے بھی بے حد لاڈ پیار میں بگڑ جاتے ہیں جو ان کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ چونکہ عورتیں تمام تر مردوں پر منحصر ہوتی ہے اس لیے ان کو اپنے حقوق کا نہ احساس ہے نہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکتی ہے۔ مراۃ العروس کی تمہید میں وہ اس طرح عورتوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں: ''تم کو قابلیت ہو تو مردوں کو کب تک خیال ہوگا، تم کو لیاقت ہو تو مردوں کو کہاں تک پاس نہ ہوگا۔ مشکل تو یہ ہے کہ تم صرف دال روٹی کو پکا لینے اور پھٹا پرانا سی لینے کو لیاقت سمجھتی ہو پھر جیسی لیاقت ہے ویسی ہی قدر ہے۔''[2]

'توبۃ النصوح' جس کا موضوع اولاد کی تربیت ہے اس میں بھی انھوں نے باپ کے ساتھ ماں کا رول بھی دکھایا ہے کہ: ''بچوں کی صحیح تربیت اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب ماں باپ دونوں اس میں کوشاں ہوں۔ انھوں نے اپنی ناول 'رویائے صادقہ' میں ایک خاتون کی جانب مذہبی شکوک رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔''[3]

نذیر احمد کا مقصد ان ناولوں کے ذریعے معاشرے میں عورت کی حیثیت کو بہتر بنانا تھا۔ ان کی ناول نگاری سے متأثر ہو کر اردو میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بنا کر بہت سے ناول لکھے گئے۔ انھوں نے خواتین کی کئی نسلوں کو اپنی ناول نگاری سے متأثر کیا۔ ناول نگاروں نے صرف موضوع ہی میں ان کی تقلید نہیں کی بلکہ ان کی ناولوں کے طرز کو بھی اپنایا۔ جیسا کہ رشیدۃ النساء نے لکھا ہے کہ ان کے ناولوں سے کتنی ہی لڑکیوں کی زندگیاں

---

[1] نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ ڈاکٹر زینت بشیر الیاس ٹریڈرس، حیدر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۸

[2] مراۃ العروس، تمہید، ص ۱۰

[3] نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص ۴۷

سدھر گئیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ: ''نذیر احمد کی اردو ادب کو دین یہ ہے کہ انھوں نے عورت کو جو تا حال محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے معاشرتی حیثیت دی۔ ادب میں بھی اس کی حیثیت کو اونچا کیا۔ عورت کو خود اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا اور اس سے معاشرے کی اصلاح کا بنیادی کام لیا۔ تا حال عورت معاشرے اور ادب میں آرائش و زیبائش کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ نذیر احمد نے اس کی حیثیت کو ختم کرتے ہوئے اس کو ایک فعال حرکی قوت کی حیثیت سے سامنے لائے۔''[1]

عبدالحلیم شرر جو اردو ادب میں تاریخی ناولوں کے لیے مشہور ہیں، اس میں تو انھوں نے عورتوں کے کرداروں کو فعال دکھایا ہے مگر انھوں نے جو معاشرتی ناول لکھے تقریباً ان سب کا موضوع عورتوں کی سماجی حیثیت ہے۔ تحریک نسواں میں شرر کو خاص دلچسپی تھی۔ وہ انگلستان گئے تو وہاں کی سوسائٹی میں عورت کی جو آزادی تھی وہ اس سے متأثر ہوئے۔ وہاں ''انھوں نے عورتوں کی معاشی آزادی اور مساوات کا نمونہ دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا نے عورتوں کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان سے اسی طرح معاشرے کی تعمیر کا کام لینا چاہیے جس طرح مغربی اقوام لے رہی ہیں۔''[2] انھوں نے مرضی کی شادی، بغیر دیکھے شادی کا عبرتناک انجام اور بیوہ کی دوسری شادی کو اپنی ناول کا موضوع بنایا اور پردے کی حمایت میں بہت کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ شرر نے تو اپنی ناول 'طاہرہ' میں یہ تصور پیش کیا ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر عورت شادی کرے۔ اس ناول کی ہیروئین چونکہ مغربی تعلیم حاصل کیے ہوئے اور انگریزی ریزیڈنٹ کی بیگم کی تربیت یافتہ ہے اس لیے اس کا منگیتر ولی اللہ اس شادی کو ناجائز سمجھ کر اس سے انکار کر دیتا ہے اور مصر و عرب کے سفر پر چلا جاتا ہے۔ وہاں کے علماء سے اس کو معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ عورت سے شادی جائز ہے بلکہ اہل کتاب سے بھی شادی جائز ہے۔ طاہرہ اتنے دنوں سماجی کاموں میں خود کو مصروف رکھتی ہے پھر ولی اللہ شرمندہ ہو کر اس سے شادی کی خواہش کرتا ہے اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ 'دلچسپ' میں براہِ راست آزادیٔ نسواں کو انھوں نے موضوع نہیں بنایا ہے مگر اس میں سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ جیسے شادی میں غیر دھوم دھام وغیرہ۔ عورتوں کے مسائل کو بھی ضمناً پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن سے

---

1. نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص ۷۷
2. اردو ناولوں میں نسوانی کردار۔ فہمیدہ کبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے لوگوں کو ترغیب ملے۔ اس میں انھوں نے عرب عورتوں کی مثالیں دی ہیں جو باہر کی زندگی میں حصہ لیتی تھیں، شعر کہتی تھیں۔ ان کی زندگی صرف چاردیواری تک محدود نہیں تھی۔

ان کو طبقۂ نسواں کی ابتر حالت پر سخت تشویش تھی اور معاشرے کے غلط رسم و رواج اور قیود کی شکار عورتوں سے گہری ہمدردی تھی اور وہ ناولوں کے ذریعے ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ عورتوں کے لیے خود اپنی روزی کمانے کے حق میں ہیں۔ اپنی ناول 'طاہرہ' میں وہ اس کی ہیروئین کے منہ سے کہلاتے ہیں جب کہ اس کا منگیتر اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے: ''میں پڑھانے کی نوکری کر کے یا کسی اور طرح اپنی زندگی بسر کرلوں گی۔''[1]

شرر چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں اعلیٰ تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوں اور اس بات کو لوگ سمجھیں کہ عورت ''مرد کی کنیز نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اس کی رفیق زندگی ہے۔''[2] جس زمانے میں شرر عورت کی صحیح سماجی حیثیت کا تصور پیش کرتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ان کا نظریۂ آزادیٔ نسواں کے لیے بہت ترقی پسند ہے۔

جہاں تک سرشار کا تعلق ہے انھوں نے فسانۂ آزاد اور 'کامنی' میں سماجی حیثیت کو موضوع بنایا ہے۔ فسانۂ آزاد میں وہ جس معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں وہ حقیقی سے زیادہ تخیلی ہے مگر عورتوں کی آزادی کے سلسلے میں ان کے ترقی پسند تصورات قابلِ داد ہیں۔ ان کی ہیروئین حسن آرا مختلف علوم پر دسترس رکھتی ہے۔ شعر و ادب کا ذوق ہے اور تعلیم نسواں کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ نہ صرف ناول کے ہیرو آزاد سے بے تکلفانہ سماجی موضوعات پر گفتگو کرتی ہے بلکہ اپنی سہیلیوں سے بھی سماجی برائیوں پر بحث و مباحثہ کرتی، مضمون لکھتی ہے اور اس کے لکھے ہوئے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو زیور پہنانے کی بری رسم کے خلاف جب خواتین کے درمیان مضمون پڑھتی ہے تو وہ اس طرح گفتگو کرتی ہیں:

''بہار: حسن آرا تم نے چشم بددور بڑی ترقی کی ہے۔

قمر: اس میں کیا شک ہے، مردوں کے کان میں کاٹے اس شہر میں کیا معنی ہم جانتے

---

[1] ''طاہرہ'' شاہی پریس لکھنؤ، ص ۱۳۹

[2] اردو ناول میں عورت کا تصور۔ فہمیدہ کبیر۔ ص ۴۷

ہیں، ملکوں ملکوں ڈھونڈو تو ان کا جواب نہ نکلے۔

وزیر: جیسی تعریف سنی ویسا ہی پایا ان کو۔''[1]

اس کے بعد وہ خواتین اس پر بحث کرتی ہیں کہ یہ مضمون ایک قصباتی خاتون کی سمجھ میں نہیں آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن آرا نے فارسی عربی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں اور پھر باقاعدہ یہ بحث ہوتی ہے کہ کون سے الفاظ عربی کے ہیں، کون سے فارسی کے۔ اپنے ایک مضمون میں جس کا موضوع تعلیم نسواں ہے حسن آرا عورت مرد کے مساوی صلاحیتوں کا اس طرح ذکر کرتی ہے: ''مرد اپنی ناقص العقلی سے عورتوں کو ناقص العقلی کا مفت الزام دیتے ہیں ورنہ بڑے بڑے علماء کا کلام اس قول کا شاہد ہے کہ عورتیں ذکاوت اور ذہانت میں مردوں سے کم نہیں ہیں۔''[2] یہی نہیں سرشار آگے چل کر حسن آرا سے کہلاتے ہیں: ''عورتوں کی ناقص العقلی خلقی نہیں جبلّی نہیں صرف ذکور کی عدم توجہی ان کو ناقص العقل کر دیتی ہے۔ افسوس ہے کہ گو اس میں تحصیل اور اکتساب دانش کی قابلیت موجود ہے مگر مردوں کا حسد ان کو تحصیل سے باز رکھتا ہے۔''[3]

فسانۂ آزاد میں سرشار نے انگریز عورتوں کے کردار بھی پیش کیے ہیں جو ہندوستانی عورتوں میں اصلاح کا کام کرتی ہیں۔

اپنی دوسری ناول 'کامنی' میں سرشار نے ایک پڑھی لکھی ہندو عورت کی کہانی بیان کی ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھر اور اڑوس پڑوس میں عورتوں میں بیداری پھیلاتی ہے۔ جھاڑ پھونک کی مخالفت کرتی ہے۔ ڈاکٹری علاج کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ ٹیکہ کیا ہوتا ہے اور چیچک کا ٹیکہ اگر پہلے سے لگوالیا جائے تو اس سے چیچک نہیں نکلتی اور سمجھا بجھا کر گاؤں کی ہندو مسلمان سب عورتوں کو ٹیکہ لگوانے پر راضی کر لیتی ہے۔ کامنی کے بارے میں، ''مشن کی لیڈیوں نے جب یہ سنا تو اپنے پادریوں کے اخبار میں کامنی کی خبر چھپوائی اور اس کی انگریزی اور اردو اخباروں سے نقل کیا۔''[4]

---

[1] فسانہ آزاد ترقی اردو بورڈ، ص ۱۰۳۴

[2] فسانہ آزاد ترقی اردو بورڈ، ص ۱۰۴۰

[3] فسانہ آزاد ترقی اردو بورڈ، ص ۱۰۴۰

[4] کامنی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ص ۵۱۸

’حجاب النساء‘ میں عورتوں کو ڈاکٹری کا پیشہ اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فسانۂ خورشیدی میں مصوری کرتے دکھایا ہے۔ تصویروں کی نمائش ہوتی ہے، انعام ملتا ہے۔ نذیر سجاد حیدر کی ہیروئین زبیدہ باقاعدہ ستار بجاتی ہے۔ ’کنیز‘ میں عورتوں کو تھیٹر چلانے اور اس میں رول کرنے کی حمایت کی گئی ہے۔ ’کنیز‘ اس ناول کی ہیروئین کو جب اس کا شوہر چھوڑ دیتا ہے تو بورڈنگ میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی ہے اور پھر تھیٹر چلاتی ہے اور خود رومیو جولیٹ میں جولیٹ کا پارٹ ادا کرتی ہے۔ ’گوڈر کا لال‘ اور ’روشنک بیگم‘ میں اس وقت کے اس اہم مسئلے کو پیش کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مرد تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں اور وہ جاہل عورتوں کو پسند نہیں کرتے ہیں اور اس نتیجے میں تعلیم یافتہ عورتوں سے زیادہ تر انگریز عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہیں۔ ان خواتین ناول نگاروں نے جہاں اس بات کی وکالت کی ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ وہاں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ شوہر اگر دوسری شادی کرتے تو عورت کو اس سے جلن حسد کرنے کے بجائے اس کو محبت اور صبر سے برداشت کرنا چاہیے۔ روشنک بیگم اس لیے اپنے میاں کی دوسری بیوی جو انگریز ہے، اس سے محبت اور دوستی کا برتاؤ کرتی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ناول نگار خواتین نے عورتوں کے مختلف روایتی رشتوں میں جلن، حسد، نفرت، دشمنی ناگریز سمجھی جاتی ہے، اس پر تنقید کی ہے اور عورتوں کو یہ احساس بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورتوں کو عورتوں کا دشمن نہیں دوست ہونا چاہیے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ بشیر الدین احمد نے بھی اپنی ناول ’حسن معاشرت‘ میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے پر زور دیا ہے۔ انگلستان کی خواتین کے ساتھ ہندوستان کی پڑھی لکھی خواتین کی مثالیں دی ہیں، خاص طور سے بیگم بھوپال سلطان جہاں اور سروجنی نائیڈو کی، انھوں نے اپنی ایک ناول کا اقتباس سروجنی نائیڈو کا نام کیا ہے۔

صفرا ہمایوں مرزا ’سرگزشتِ ہاجرہ‘ میں گاندھی جی اور ان کے چرخے کا ذکر کرتی ہیں اور اس میں انھوں نے کہا ہے کہ جب تک عورتوں کو آزادی نہیں ملتی، ہندوستان کو ہوم رول نہیں مل سکتا۔ اس میں مسلمان عورتوں کے لیے موسیقی کی بھی حمایت ہے اور اس میں ایک خبر کی شکل میں ’ہندو مسلم شادی‘ کا بھی ذکر ہے۔ ان کی دوسری ناول زہرہ یا مشیر نسواں میں عورتوں کے لیے باغبانی کی حمایت، خاندان میں شادی کا طبی لحاظ سے مضر ہونا بتایا گیا

ہے۔ ناول کی ہیروئین زہرہ تعلیم کے موضوع پر ایک لیکچر لکھتی ہے۔ وہ پڑھ کر جلسے میں سنایا جاتا ہے اور اس کا ان الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے۔ ''ہمارے ملک میں نہ صرف مرد ہی اپنی ترقی کے اسباب و وسائل پر غور کرتے ہیں بلکہ عورتوں نے بھی اپنی قوم اور اپنے فرقہ کی ترقی اور تدابیر سوچنا اور ان تدابیر میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہ بہت نیک فال ہے کہ ہمارے گروہ کا وہ حصہ جس کے ہاتھ میں ہمارے آسائش و آرام کا انتظام اور آئندہ نسلوں کی ترقی کی باگ ہے۔ روشن خیال اور نفع و نقصان کو سوچنے والا ہو۔ جس معزز و محترم خاتون کی طرف سے مجھ کو آج اس عظیم الشان جلسہ میں مضمون پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے وہ یہاں کے شریف و معزز خاندان کی لڑکی ہے اور انھوں نے اپنے شوق و محنت سے وہ کمال حاصل کیے ہیں۔ من حیث المجموع یورپ کی کسی لیڈی میں پائے جاتے ہوں۔''[1]
زہرہ بیگم جو تعلیم نسواں کی کوششیں کرتی ہیں ان کو اس زمانے کی تحریک نسواں کے حالی اور شبلی کو سراہتے دکھایا گیا ہے۔ 'گوڈر کے لال' میں اس بات کی مخالفت کی گئی ہے کہ عورت مرد کی اس حد تک تابع ہے کہ اس کو اس کی مرضی اور خدمت کے لیے اپنی عبادت کو بھی چھوڑ دینا چاہیے۔

ماہِ درخشاں میں دوسرے مذاہب میں شادی کی بھی حمایت نہے، جو دھابائی کی مثال اور اس سے آپس میں بھائی چارے کا فروغ ہونا دکھایا گیا ہے۔

نذر سجاد حیدر نے اپنی ناول 'جاں باز' میں اپنی ہیروئین کو گاندھی جی اور ان کی تحریک، کھدر اور چرخہ کاتنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ خلافت کے جلسے میں زنانہ جلسہ اور شہر سے باہر کی عورتوں کو اس میں شریک ہوتے دکھایا ہے۔ ناول کی ہیروئین زبیدہ کے بارے میں ایک مرد کردار یوں اظہار کرتا ہے۔ ''آفریں ہے آفریں، ہندیوں کا بیڑہ اب پار ہے۔ جس میں ایسی محب وطن دیویاں پیدا ہو گئیں۔''[2]

راشد الخیری کی زیادہ تر ناولوں کا موضوع عورت اور اس کی سماجی حیثیت ہے۔ انھوں نے سماج میں مجموعی حیثیت سے عورت کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اسلام میں اس کے حقوق سے لوگوں کو روشناس کرایا اور ہندوستانی سماج میں عورتوں پر جو قید و بند کی سختیاں تھیں

---

[1] زہرہ یا مشیر نسواں۔ ص ۱۰۵

[2] جاں باز، زیراکس کاپی، مولانا آزاد لائبریری۔ ص ۲۷

اور وہ معاشرے میں جو سختیاں جھیل رہی تھیں ان کی عکاسی کی۔ دوسری طرف انھوں نے مغربی تہذیب کے زیر اثر عورتوں کی غلط آزادی کے اثرات معاشرے پر پڑ رہے تھے ان مسائل کو بھی انھوں نے اپنی ناولوں کا موضوع بنایا اور اس 'آزادی' کی مخالفت کی۔ چونکہ اس سے عورتوں کی تعلیم اور جائز آزادی کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ راشد الخیری کو سماج میں عورت کی پست حالت کا احساس تھا۔ 'صبح زندگی' میں کہتے ہیں۔ ''یہ لڑکیاں بے چاریاں ماں کی محتاج، باپ کی دست نگر جو ہاتھ اٹھا کر دے دیا وہ لے لیا، تم نے جیتے جی ان کو لونڈیوں سے بدتر بنا دیا۔ سنا ہے کہ عرب میں جیتی لڑکیوں کو گاڑ دیتے تھے بلا سے وہ اچھا تھا۔ یہ روز روز کے کچوکے اور ہر وقت کی آفت تو نہ تھی۔''[1]

راشد الخیری کا خیال تھا کہ قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب عورتوں کی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ان کو تعلیم یافتہ بنایا جائے، ان کو ان کے جائز حقوق دیے جائیں۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کی جائے لیکن بقول فہمیدہ کبیر: ''راشد الخیری عورتوں کے حقوق کا احساس مردوں کو دلانا چاہتے تھے، عورتوں کو نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مرد جائز حقوق انھیں دینے پر تیار نہ ہوں خواتین کو اس کی ترغیب دینا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑیں سودمند ہونے کے بجائے مضر ہو سکتا ہے۔''[2] اور ہمارے خیال میں یہ بات درست بھی تھی اور زیادہ سودمند بھی۔ چونکہ عورتیں جس پسماندگی کی حالت میں تھیں وہ ان حقوق کا مطالبہ کیسے کر سکتی تھیں۔ نہ ان کی اہمیت سمجھ سکتی تھیں اور راشد الخیری اس کے قائل نہیں تھے کہ عورت مغرب کی عورت کی طرح مردوں سے بغاوت کرے۔ راشد الخیری نے عورتوں کے اور مسئلوں کے ساتھ ساتھ ترکۂ پدری سے ان کی محرومی کو بھی اپنی ناولوں میں اٹھایا ہے۔ انھوں نے جہیز کی اس لیے حمایت کی کہ اسی بہانے عورت کو کچھ مل جاتا ہے۔ اس صورت میں جہیز کی رسم کو ختم کرنا عورت کے اپنے فائدہ مند نہیں ہے۔ وہ ازدواجی زندگی میں مرد عورت دونوں کو درجہ مساوی سمجھتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی اپنی ناولوں میں ایسے خیالات پیش کیے جو عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے میں معاون ہوئے۔ انھوں نے اپنی ناولوں 'شریف زادہ' اور 'اختری بیگم' میں عورت کے ایسے کردار دکھائے ہیں جو صحیح تعلیم و

---

[1] صبح زندگی۔ ص ۱

[2] اردو ناول میں عورت کا تصور۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۴

تربیت نہ ہونے کے سبب اپنے گھر اور سماج میں خرابیاں پیدا کرتی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ عورتیں اگر طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہیں تو یہ ان کی فطری خرابیاں نہیں ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے شوہر اور بیوی کے مساوی درجے پر زور دیا ہے۔ 'شریف زادہ' میں ایک جگہ کہتے ہیں: ''میاں بیوی کے معاملے میں ایک خاص بات اعتبار ہے، گھر کا کارخانہ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ ساکھ نہ ہو...... اور باہمی اعتبار، میاں بیوی دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ راست بازی اصل اصول ہے۔''[1]

رسوا کا زمانہ انیسویں صدی کے ربع آخر کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں نئی تہذیب کا اثر تیزی سے ہو رہا تھا اور رسوا کو یہ احساس تھا کہ اس معاشرے میں عورت کی حیثیت میں بھی تبدیلی آنا ضروری ہے۔ وہ اپنی ناول 'اختری بیگم' میں ایک عورت کو ملازمت کرتے بھی دکھاتے ہیں۔ وہ اپنی اور اپنی ماں کا بار خود اٹھاتی ہے۔ 'شریف زادہ' میں بھی انھوں نے اپنے ہیرو کی بیوی کو سلائی کر کے مالی طور پر میاں کا ہاتھ بٹاتے دکھایا ہے۔ رسوا کے یہاں دھندلا سا ہی مگر عورت کا وہ تصور ابھرتا ہے جس میں زندگی کی جدوجہد میں وہ مرد کے برابر کی شریک ہے۔

کشن پرشاد کول نے اپنے ناول شاما میں جو ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا تھا اس کا موضوع ہندو سماج میں عورتوں پر بے جا قسم کی سماجی اور مذہبی بندشیں ہیں۔ شاما اپنے شوہر اور سسرال کے ظلم سے گھبرا کر ان کا گھر چھوڑ دیتی ہے اور سماجی بندشوں کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ اس طرح ناول نگار نے یہ بتایا ہے کہ عورت کو خاموشی سے ظلم و ستم سہنے کے بجائے شوہر کا گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

منشی پریم چند نے 'بیوہ' سے لے کر 'گئودان' تک اپنے ہر ناول میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا۔ کبھی براہِ راست کبھی بالواسطہ ہندو، مسلمان، عیسائی، شہری، دیہاتی، قصباتی متوسط طبقے کی، نچلے طبقے کی، اونچے طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو انھوں نے بہت دردمندی سے حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ''پریم چند نے عورتوں کے حقوق کی طرف داری کی۔ وہ طرح طرح سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔''[2]

---

[1] شریف زادہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء، ص ۷۰

[2] پریم چند کے نسوانی کردار، ص ۱۶۲

ان کو طبقہ نسواں کی زبوں حالی کا احساس تھا اور وہ مردوں کی دنیا میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کے خلاف برابر آواز اٹھاتے رہے۔ پریم چند ہندو سماج میں کنیادان کی رسم کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے غلامی کی بو آتی ہے۔ پریم چند میاں بیوی کے مساوی درجے کی وکالت تو کرتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ یہ سمجھتے ہی کہ عورت کا ایک الگ وجود ہے۔ 'چوگانِ ہستی' کی اندوا اپنے شوہر سے کہتی ہیں کہ: ''بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی رفیق بنے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے۔''[1]

اس ناول کی صوفیہ بھی اپنے ماں باپ سے اختلاف کی صورت میں معاشی طور پر خود کو خود کفیل بنا لیتی ہے۔ پریم چند اپنی ناول 'منگل سوتر' میں ایک کردار پشپا سے صاف صاف کہلواتے ہیں: ''اگر میں تمھاری محتاج ہوں تو تم میرے محتاج ہو۔ میں تمھارے گھر میں جتنا کام کرتی ہوں اتنا ہی کام دوسروں کے گھر جا کر کروں تو اپنا نباہ کر سکتی ہوں یا نہیں...... تب میں جو کماؤں گی میرا ہوگا۔ یہاں چاہے میں جان بھی دے دوں تو میرا کسی چیز پر حق نہیں ہے۔ تم جب چاہو مجھے گھر سے نکال سکتے ہو۔''[2] منگل سوتر میں بھی پریم چند نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آخر عورتیں کیوں مردوں کے سہارے زندگی بسر کریں۔ خود کفیل کیوں نہ ہوں۔ اس میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ 'پتی ورتا' کا تصور عورت کی انفرادیت کو ختم کرتا ہے۔

پریم چند نے اپنے ناولوں میں عورتوں کو سیاسی اور سماجی تحریکوں میں حصہ لیتے بھی دکھایا ہے اور یہاں وہ عورت کو چہار دیواری سے نکال کر سیاسی اور سماجی پلیٹ فارم پر لے آئے ہیں۔ ان کی ناول 'بیوہ' کی کردار پریما بیواؤں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے امرت رائے کی حمایت میں اسٹیج پر آ کر لوگوں کو مخاطب کرتی ہے اور ہندوستانی بیواؤں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتی ہے۔ اسی طرح 'چوگانِ ہستی' میں جانہوی کے کردار میں وہ ایک باعمل قوم پرست عورت کو دکھاتے ہیں۔ اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہے۔ اسی ناول کی دوسری عورت صوفیہ بھی تحریک آزادی میں حصہ لیتی ہے۔ ستیہ گرہ کرتی ہے۔ ان کی ناول 'میدانِ عمل' کا موضوع ہندوستان کی تحریک آزادی ہے۔ اس میں انھوں نے بہت سی

---

[1] چوگانِ ہستی، دار الاشاعت لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۷۸۵

[2] منگل سوتر، ص ۱۲، بحوالہ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ شمیم نکہت۔ ص ۲۲۶

عورتوں کو اس میں سرگرمی سے حصہ لیتے دکھایا۔ چاہے وہ سکھدا ہو یا سکینہ اور اس کی ماں پٹھانی منی ہو یا رمادیوی۔ نینا تو اپنی جان ہی دے دیتی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند عورت مرد کی مساوی درجے کے قائل تھے۔ ''گھریلو معاملات ہو یا ملکی مسائل ان کی نگاہ میں اسی وقت حل کیے جاسکتے ہیں جب دونوں اس کے لیے کوشش کریں اگر ان میں کسی کا مرتبہ کم ہوگا یا زیادہ ہوگا تو ایک کی برتری دوسرے کے کام کام میں حارج ہوگی۔وہ سماج کی ناانصافیوں کے خلاف پوری طرح ٹکر نہیں لے سکیں گے۔انھوں نے اپنی ناولوں میں عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔''[1]

اس کے بعد کی ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت کا تصور زیادہ وسیع ہوا اور مسلمان خواتین کے ایسے کردار ملنے لگے جو پردے سے باہر آکر مردوں کے ساتھ باہری زندگی میں حصہ لینے لگیں۔ایسی ناولوں میں عصمت کی 'ٹیڑھی لکیر' ہے جس میں بالوسطہ طور پر عورت کی سماجی حیثیت کے بہتر ہونے کے اشارے ہیں اور آزادنہ طور پر ہیروئین مردوں سے ملتی ہے، اپنی پسند کی شادی کرتی ہے اور اس کے علاوہ دوسری عورتیں بھی جو اسکولوں میں پڑھاتی ہیں باہر سفر کرتی ہیں اور ان عورتوں کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں مردوں کے ان کے ساتھ جو رویے ہیں ان کو عصمت نے اپنے مخصوص انداز میں ٹیڑھی لکیر میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ ناول کی ہیروئین شمن انقلابی جلسوں میں عورت کے رول کے بارے میں جھنجلا کر کہتی ہے۔''انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی۔دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا لیکن ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کا حصہ بس نام کا تھا۔عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لیے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے۔رزلیوشن تجویز کرتے۔تمام کاغذات تیار کرتے اور یہ وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح بتائی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں۔وہ بھی عین وقت پر مددگار آکر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا۔''[2]

اسی طرح شمن جب لڑکیوں کے اسکول میں کام کرنے جاتی ہے تو وہاں جو عورتیں پڑھا رہی ہیں ان کو دیکھ کر اس پر یہ ردعمل ہوتا ہے: ''سب کی سب لاغر دکھیا اور نادار نظر

---

[1] پریم چند۔ہنس راج رہبر، بحوالہ پریم چند کے نسوانی کردار، شمیم نکہت، ص ۱۱۳

[2] ٹیڑھی لکیر، نیا ادارہ لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۴۲۵

آ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبہ میں ناکام ہونے کے بعد آخری سہارا محکمۂ تعلیم ہی ملتا ہے یا تو بدصورتی یا غربت کی وجہ سے، میاں نہ ملا یا بیوہ ہوگئیں، جن پر جا کر پڑیں انھوں نے نکال دیا۔ بال بچوں کی خاطر پیشہ کر رہی ہیں۔''[1]

اس اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے باہر نکل کر عورت اب وقت ضرورت خود اپنی روزی روٹی کمانے لگی ہے اور سماج میں اس بات کو قبول کیا جا رہا ہے۔ ناول کی ہیروئین ثمن اسکول کالج کی تعلیم یافتہ ہے۔ اسکول میں پڑھاتی ہے، ہیڈ مسٹریس بنتی ہے۔ غیر ملکی شوہر سے سیاست پر بحث کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں اب اتنی روشن خیالی پیدا ہو رہی تھی کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں عورت کو سماج کے مروجہ اصولوں پر اپنی پسند کی زندگی گزارنے کے مواقع ملنے لگے اور وہ چاہے تو ٹیڑھی لکیر پر بھی چل سکتی ہے۔

فیاض علی کی ناول 'شمیم' اور انور' میں لڑکیوں کو دکھایا گیا ہے جو مردوں سے اپنے حقوق طلب کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ فیاض علی نے اپنے ایک نسوانی کردار سے یہ بھی کہلوا دیا ہے کہ عورتیں وفا کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ ان کو آزادانہ طور پر مردوں سے ملنے کے مواقع ہی نہیں ملتے۔ اگر ان کو بھی وہی آزادی نصیب ہو جو مردوں کو ہے تو ان کی وفا کے معیار بھی دوسرے ہوں۔

عزیز احمد کی ناولوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آزادئ نسواں کا اثر ہندوستان کے ایک طبقے پر تیزی سے ہو رہا ہے۔ لڑکیاں کانوینٹ میں پڑھتی ہیں اور مردوں سے آزادانہ ملتی جلتی ہیں اور اپنے حقوق سے پوری طرح آگاہ ہیں اور مردوں کے ظلم برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ طلاق اور خلع کی باتیں کرتی ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی عذرا میں متوسط طبقے کے مسلمان خاندان کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کی ابتداء میں ہیروئین تعلیم کی شوقین ہوتے ہوئے بھی خاطر خواہ تعلیم حاصل نہیں کرسکتی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اتنی تبدیلی آتی ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی نہ ہونے کی صورت میں غیر شادی شدہ رہ کر عورتوں کا رسالہ نکالتی ہے اور ملک کے نامور ادیبوں سے دادِ تحسین وصول کرتی ہے اور جب اس کی شادی اس کے پسند کے ہم مذہب، ہم خیال 'انصار' سے ہو جاتی ہے تو ملک کی فضا کو دیکھ کر

---

[1] ٹیڑھی لکیر، نیا ادارہ لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۳۶۰

اس کے دل میں بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کی آرزو جاگتی ہے۔ مصنفہ لکھتی ہیں: ''مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی تحریک آزادی میں حصہ لے رہی تھیں...... عذرا کو ۱۹۲۰ء سے ملک کی آزادی سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں کئی سال کھدر پہنا اور چرخہ کاتا تھا...... اب انصار کی محبت اور اس کی نئی تحریک کے شروع ہونے سے پھر بھڑک اٹھی لے......'' اور جب انصار کو غیر ملکی حکومت گرفتار کر لیتی ہے تو عذرا بھی اس کے پیچھے پیچھے جیل خانے جانے کی خواہش کرتی ہے اور جب وہ منع کرتا تو عذرا کہتی ہے: ''تمھارے نزدیک مادرِ وطن کی خدمت اور اس کی آزادی کے لیے قربانی کا حق صرف مردوں کو حاصل ہے۔ ہم اس حق سے بھی محروم ہیں، تم تو عورتوں کی آزادی اور مساوات کے بڑے حامی بنتے ہو۔''[1]

پھر انصار اس کی وضاحت کرتا ہے کہ کیونکہ وہ ماں بننے والی ہے اس لیے اس کا اس حالت میں جیل جانا مناسب نہیں ہے اور وہ اپنے اخبار 'آزادی' کو نکالنے کی ذمہ داری سونپتا ہے تو عذرا کہتی ہے، ''انصار میں اتنے بڑے کام کی ذمہ داری کے قابل نہیں'' تو انصار جواب دیتا ہے:

''عذرا پیاری مجھے یقین ہے کہ تم اس کام کو پوری ذمہ داری سے کر سکوگی۔ میں تم میں اس کی صلاحیت نہ دیکھتا تو تم سے کہتا ہی کیوں۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی کہ میری بیوی نے میرے بعد میرے کام کو سنبھالا۔ کتنا فخر ہوگا کہ میری عذرا اتنے بڑے اخبار کی ادارت کر رہی ہے۔ یہ میرے لیے ہی نہیں تمھارے سارے خاندان بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لیے باعث فخر ہوگا۔ اس ذریعہ سے نہ صرف تم اپنے ملک اور قوم کی خدمت کر سکوگی بلکہ اپنی روزی بھی بغیر کسی کی محتاجی کے خود پیدا کر لوگی۔''[2]

اسی طرح اے آر خاتون کی ناولوں 'شمع' اور 'افشاں' میں بھی جس فضا اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی قدامت پرست گھرانوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم اور آزادی کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔

کرشن چندر کی ناول 'شکست' ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا ہے مگر

---

۱ عذرا موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۶۴

۲ عذرا موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۶۶

بالواسطہ طور پر وہ عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کی حمایت کرتا ہے۔ اس کا موضوع فرسودہ نظام کے خلاف نئے تعلیم یافتہ نوجوان کی بغاوت ہے جو کسی ذات پات کی پرواہ کیے بغیر اپنے سے نیچی ذات کی عورت کو بیوی بنا کر سماج میں اونچا مقام دینا چاہتا ہے جب کہ اب تک ان عورتوں کو اونچا طبقہ اپنی ہوس کا نشانہ تو بناتا ہے مگر بیوی کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جس بات کا اشارہ پریم چند نے 'گئودان' میں کیا کہ گاؤں کا پنڈت داتا دین ناول کی ہیروئین جھنیا کو اس پر لعنت ملامت کرتا ہے کہ اس نے نیچ ذات 'جھنیا' کو کیوں اپنی بہو بنالیا۔ اگر کے بیٹے کے جھنیا سے ناجائز تعلقات ہے تو ہوا کریں۔ بیوی کا درجہ تو نہیں ملنا چاہیے۔ نیچ ذات عورت کو داتا دین کہتا ہے: "تمھیں اس پاپن کو نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ دودھ میں مکھی پڑ جاتی ہے تو آدمی اسے نکال کر پھینک دیتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے۔ سوچو کتنی جگ ہنسائی اور بدنامی ہو رہی ہے۔[1]

کرشن چندر نے اسی موضوع کو اپنی ناول میں لیا جس میں انقلابی ہیرو اپنی محبوبہ کو پانے میں کامیاب تو نہیں ہو پاتا مگر سماج میں ایسا بھی سوچا جانے لگا ہے۔ امکانات سے انھوں نے شکست کے ذریعے سماج کو آگاہ کیا ہے۔

ابتداء سے کر ۱۹۴۷ تک جو ناول لکھے گئے اور بہت لکھے گئے۔ مجموعی طور پر ان کا موضوع عورت کی سماجی معیوبیت ہے اور زیادہ تر ناول لکھے ہی اس لئے گئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان ناولوں نے عورت کی سماجی حالت کو بہتر بنانے میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے لئے مصلحین قوم کی کوششیں کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتیں اور عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کرتیں۔ اگر ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک لکھے جانے والے تمام ناولوں کا مطالعہ کرے تو باآسانی ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت کی روئداد بیان کی جاسکتی ہے۔

---

[1] گئودان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۴

خلاصہ بحث

ہم نے اپنی تحقیق کے دائرے کو ۱۹۴۷ء تک محدود اس لئے کیا ہے کہ آزادی کے بعد عورتوں کی سماجی حیثیت میں ایک انقلابی فرق آیا ہے۔ اس کی وجہ ایک یہ ہے کہ جب ملک آزاد ہوا کانگریس پارٹی برسر اقتدار آئی جس نے گاندھی جی کی قیادت میں عورتوں کی آزادی اور برابری کی آواز اٹھائی تھی اور آزادی کی جنگ میں ہندوستانی عورتوں کو بلا مذہب، ذات پات اور شہر ودیہات کے فرق کے حصہ لینے پر اکسایا تھا۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ جب ہمارے ملک کی آبادی کا وہ حصہ ترقی نہیں کرے گا جو عورتوں پر مشتمل ہے تو ہندوستان کیسے ترقی کر سکتا ہے؟ اور نہ ہم عورتوں کی مدد کی لڑائی جیت سکیں گے۔

برٹش گورنمنٹ کے تحت عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا اس کے حق کو لینے کے بڑے پیمانے پر جدوجہد ہوئی۔ آخر کار ۱۹۲۶ء میں پہلی بار عورتوں نے الیکشن میں حصہ لیا، نمک ستیہ گرہ کا ذکر کرتے Women of India میں کملادیوی چٹوپادھیائے لکھتی ہیں:

''پہلے گاندھی جی کچھ سمجھ کر عورتوں کو عام تحریک میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن جب یہ تحریک وسیع ہوگئی تو انھوں نے پہلی بار کچھ منتخب عورتوں کو نمک ستیہ گرہ میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ جس سے ہندوستانی انقلاب کی ابتداء ہوئی۔ یہ ستیہ گرہ ۶ راپریل ۱۹۳۰ء کی صبح شروع ہوئی اور اس دن سورج غروب ہونے کے وقت تک ایک عوامی تحریک بن کر سارے ملک میں پھیل گئی۔'' [1]

اس طرح نمک ستیہ گرہ ایک طرف جنگ آزادی میں تیزی لائی دوسری طرف عورتوں کی آزادی اور مساوات کی جدوجہد میں اس نے اہم رول ادا کیا اور انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۱ء

1- Women of India by Tara Ali Beg, page No. 18

میں اپنے کراچی کے اجلاس میں عورتوں کو بہت سے بنیادی حق دینے کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے اعلان نامے میں کہا، جنس کے اختلاف پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی۔

اسی لیے جب ملک آزاد ہوا تو دستورِ ہند نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی سماجی حقوق دیے اور ان کے مساوی حقوق کا اقرار کیا گیا۔ اس بات کی یقین دہانی کی گئی کہ ان کا عورت ہونا ان کی آزادی اور ترقی میں حائل نہیں ہوگا۔ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے طرح طرح کے قانون پاس ہوئے۔ ان کی فلاح وبہبودی کے لیے طرح طرح کے منصوبے چلائے گئے اور نصف صدی میں عورتیں زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آنے لگیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ فلم اور تھیٹر میں عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا جانے لگا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں کمیونزم کا بہت زور ہوا اور اس کے اثر سے بھی عورتوں کی سماجی حیثیت پر اچھا اثر پڑا۔ جو شیلے نوجوانوں نے اپنی نسل کی نوجوان لڑکیوں کو 'انقلاب' لانے میں اپنا ساتھی بنایا۔ ان کو کامریڈ کہا اور آنچل کو پرچم بنانے کی ترغیب دی۔ شہروں کی متوسط طبقوں کی اکثر لڑکیوں نے پارٹی جوائن کرلی اور سارے سماجی قیود کو توڑ دیا۔ ترقی پسند تحریک جو کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ تھا: ''اس کے اثر کے تحت عورت کے روایتی تصور میں تبدیلی اور شعوری طور پر اس کے مسائل اور زندگی کی دوڑ میں اس کے برابر چلانے کا احساس ہونے لگا۔''[1]

جہاں تک ہندوستان کے دیہاتوں کا تعلق ہے وہاں چونکہ عورت معاشی طور پر مرد کی معاون رہی ہے اس لیے وہاں اس پر اس قسم کی قیود نہیں تھے جو قصبوں اور شہروں کی عورتوں پر تھے۔ مگر ہم پرستی اور جہالت کی بناء پر دیہاتی عورت بھی طرح طرح کی ناانصافیوں کی شکار تھی مگر آزادی کے بعد عورتوں کی حالت میں جو بہتری آئی اس کا اثر دیہاتوں پر بھی ہوا۔ اب گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم کی بات انوکھی اور عجیب نہیں معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں چند جماعتیں پاس کر کے چھوڑ دیتی ہیں مگر اسکول تو جاتی ہیں، پڑھتی تو ہیں اور کم ہی سہی مگر ایسی بھی لڑکیاں ہیں جو پڑھ لکھ کر مختلف کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ سماج سیویکائیں، نرسیں اور مڈوائف ہیں، استانیاں

---

[1] شارب ردولوی، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور۔ خورشید زہرا عابدی۔ تعارف، ص ۷

ہیں۔عورتوں کی غذااورلباس کا معیار بھی بڑھا ہے۔اب وہ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بالکل بے بہرہ نہیں ہیں۔ان کوشہر میں ہونے والی صنعتی اور سائنسی تبدیلیوں کا علم بھی ہےاور بعض سے وہ فائدہ بھی اٹھارہی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً پردے کا رواج ختم ہوگیا۔بچپن کی شادی کا رواج شہروں میں تو بالکل نہیں رہااور گاؤں میں رفتہ رفتہ ختم ہورہا ہے۔شادی میں ذات پات بلکہ مذہب کا لحاظ کم رہنے لگا۔لڑکے لڑکیوں کوایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے، ملنے جلنےاور کام کرنے کے مواقع ملنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور اپنی پسند کی شادی عام ہوگئی۔ ہندو مسلم شادی آزادی کے پہلے دہے میں شروع ہوگئی تھی۔شروع میں اس کی مخالفتیں ہوئیں۔ایسی خبریں اخباروں کی سرخیاں بنیں مگر رفتہ رفتہ لوگوں نے اسے تسلیم کرلیا۔خوشی سے نہ سہی مجبوری سے ہی سہی۔اس کی ایک وجہ ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام بھی ہے۔جس کی وجہ سے مسلمانوں کی بڑی تعداد پاکستان ہجرت کرگئی اوراچھے مسلمان لڑکوں کی کمی ہوگئی۔

آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہرانسان کواس کی فطری خصوصیات، خلقی ساخت اور خواہش کی بناء پر ترقی کا موقع ملے اوراس کی ترقی کی راہ میں کوئی سماجی یا قانونی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ جہاں تک قانون کا سوال ہےاس میں ہندوستان میں بڑی حد تک عورت کی آزادی اوراس کے حقوق کی حفاظت کا خیال رکھا گیا ہے۔قانون کی نظر میں عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہےاور اس کا شعور بھی ہندوستانی عورت میں پیدا ہورہا ہے۔ جب اسے اپنے جائز حقوق سے محروم کردیا جاتا ہےتو وہ اکثر صورتوں میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہےاوراس کوانصاف بھی ملتا ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قانون کے شعبے میں بڑی تعداد میں خواتین ہیں اور وہ اپنی ہم جنسوں کی مدد کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔

اب عورتوں کوتعلیم اور کیریئر بنانے کے مواقع حاصل ہیں۔اپنی پسند کی شادی، بیوہ کی شادی طلاق یا علیحدگی کا حق اسے حاصل ہے۔جائیداد میں اس کا حق ہوتا ہے۔ازدواجی حیثیت کو ظاہر کرنے کی جوعلامت ہیں ان کواختیار کرنا یا نہ کرنااس کی مرضی پر منحصر ہے۔شہر کی عورتیں منگل سوتر، بچھوے، چوڑیاں پہننا، مانگ میں سیندور لگانا ضروری نہیں سمجھتی تھیں۔ بیواؤں پراب اس

قسم کی سختیاں نہیں کی جاتیں۔ سفید کپڑے پہننے یا چوڑیاں اور زیور پہننے سے انھیں کوئی نہیں روکتا نہ اس پر معترض ہوتا ہے۔ ان چیزوں کو ترک کرنے کا رجحان صرف نئی تعلیم یافتہ لڑکیوں ہی میں نہیں غیر تعلیم یافتہ، بڑی عمر کی خواتین میں بھی بڑھ رہا ہے۔

تعلیم کے میدان میں لڑکیوں کی کارکردگی لڑکوں سے زیادہ اچھی ہے۔ وہ محنت سے تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ذمہ داری سے کنبوں کی کفالت کرتی ہیں۔ لڑکیوں میں پیشہ وارانہ تعلیم کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے۔ بعض پیشے ان کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ زیادہ تر انہی کو اختیار کرتی ہیں۔ مگر اب دوسرے اور شعبوں میں جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور مجموعی حیثیت سے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد عورت کی حیثیت میں نمایاں فرق آیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں لکھی اردو ناولوں کا اگر ہم جائزہ لیں تو اس سے ہمیں اس کی ترقی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اردو ناولوں کا اب بھی موضوع ہے مگر اب اس کی نوعیت دوسری ہے۔ آزادی کے بعد جو معاشرہ وجود میں آیا اور اس میں عورت کو کن کن مختلف حالات سے گزرنا پڑا اور اس کے مسائل میں بھی تبدیلی آئی۔ آزادی اور حقوق نسواں کا مفہوم بدلا ہے۔ اب عورت نے بنیادی حقوق حاصل کر لیے ہیں مگر ان حقوق کو حاصل کر کے جب وہ ترقی کی اگلی منزل کی طرف گامزن ہے تو اس کو بدلتے معاشرے اور بدلتے رول میں دوسری نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔ مثلاً مردوں کے ساتھ کام کرنے کے مسائل، آزاد تعلیم یافتہ خود مختار عورت کے گھریلو مسائل، صدیوں سے عورت کی کم تر حیثیت کے تصور کی وجہ سے مرد اور عورت کا ٹکراؤ، اس سلسلے میں مردوں کی نفسیاتی گتھیاں، جذباتی طور پر مردوں کا ان کو بلیک میل کرنا، آزادی کے نام پر ان کا مختلف سطحوں پر استحصال اور ان ہی مسئلوں کو ناولوں میں پیش کیا جارہا ہے۔

اب عورت کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو کمانے کا حق تو مل گیا ہے مگر اس کی اپنی کمائی پر اس کا حق نہیں ہے نہ اس کو اپنی پسند کے مطابق خرچ کرنے کی اجازت۔ اب اس کو باہر نکلنے کی اجازت تو ہے مگر اس شک میں مبتلا ہو کر کہ وہ جانے کس کس سے ملتی ہے، کہاں کہاں جاتی ہے، ہنستی ہے، بولتی ہے۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔ عورت سے متعلق جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ

رہی ہے۔ آج کی عورت کا مسئلہ اس کا تشخص اور اس کی شناخت ہے۔ اس کے باوجود کہ قانوناً ان کو ہر طرح کی آزادی ہے مگر ان کی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات ہیں کیونکہ قانون اور سوشل ریلیٹی میں بہت فرق ہے۔ ان مسئلوں کو اردو ناول نگار آج بہت اچھی طرح پیش کر رہے ہیں۔

ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اس کی ترقی کی راہ میں بہت سی مشکلات ہیں۔ یہی معاملہ عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا ہے کہ وہ سب اسکیمیں، وہ سب منصوبے، وہ سب کمیشن عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے وہ سب ادارے پورے طور پر ہندوستانی عورت کو وہ مقام نہیں دلا سکے ہیں جس کی وہ مستحق ہے اور اب بھی ہمیں عورتوں کی سماجی حیثیت میں ایک تضاد ملتا ہے اور اس ترقی اور آزادی میں شدید قسم کا عدم توازن ہے مگر اس کے ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کی جدوجہد جس کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا تھا اب جب کہ بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے عورت کی سماجی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ اصولی طور پر اس کو مان لیا گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور سماج میں ان کا مساوی درجہ ہونا چاہیے۔

عورت چار دیواری کو پھاند کر باہر نکل آئی ہے۔ بہ حیثیت قانون داں، اداکار، آرٹسٹ، موسیقار عورتوں نے ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہیں، اسٹیج ڈائرکٹر ہیں، پولیس میں ہیں، انجینئر ہیں، ایئر ہوسٹس ہیں، کم ہی سہی مگر حکومت میں ہیں۔ وہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرتی ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں اور غیر ممالک کو جانے والی ثقافتی وفود کی سربراہی کرتی ہیں اور عورت کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی ہے، ظلم و تشدد ہوتا ہے۔ اس کے خلاف عورتیں آواز اٹھاتی ہیں۔ اخباروں میں عورتوں کے خلاف ہونے والی ناانصافی، ظلم و تشدد کو جلی حرفوں میں چھاپا جاتا ہے۔ ان کو اخباروں میں نمایاں مقام ملتا ہے۔ اس کے مسائل پر کانفرنسیں ہوتی ہیں، جلوس نکلتے ہیں، اس کی حمایت میں ہر کونے سے آوازیں آتی ہیں اور عورت کی آزادی، ترقی اور سماجی برابری کے لئے فضا پوری طرح بن چکی ہے اور اس فضا کو بنانے اور عورت کو سماجی رتبے کو بڑھانے میں ہماری اردو ناولوں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے لکھنے والے اردو کے اہم ناول نویس تو

تھے ہی جن میں سے کچھ نے براہِ راست عورتوں کی سماجی حیثیت کو اپنی ناولوں کا موضوع بنایا۔ بعض نے بالواسطہ اپنی ناولوں میں اس سے متعلق مسائل کو اٹھایا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے صرف آزادیِ نسواں کی حمایت کے لیے ناول تصنیف کیے اور ان ناول نگاروں میں خواتین ناول نگاروں کی بھی بڑی تعداد تھی جنھوں نے اس زمانے میں سارے سماجی قیود اور نامساعد حالات کے باوجود ناول تصنیف کیے اور عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا۔

کتابیات

مصنف کا نام	کتاب کا نام	مطبع و ناشر	سنہ اشاعت
۱۔ ابو البیان تسنیم علوی	چمپا	کتاب والی کوٹھی، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
۲۔ ابو الکلام آزاد	ترجمان القرآن حصہ اوّل و دوم	زمزم کمپنی لمیٹڈ، لاہور	۱۹۳۱ء
۳۔ " "	مسلمان عورت	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	جون ۱۹۸۷ء
۴۔ احمد حسین خاں (منشی)	گیتی آرا	موہیال متر، لاہور	درج نہیں ہے
۵۔ " "	نظیر بیگم	گیلانی پریس، لاہور	" "
۶۔ اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی	" "
۷۔ افتخار احمد بلگرامی	حیات النذیر	شمسی پریس، دہلی	۱۹۱۲ء
۸۔ افضل الدین	فسانہ خورشیدی	مطبع سیدی، پٹنہ	۱۹۰۵ء
۹۔ احتشام حسین (سید)	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۱۰۔ احسن فاروقی (خواجہ)	ناول کیا ہے؟	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	جنوری ۱۹۶۲ء
۱۱۔ احمد رضا	بڈھے میاں	سلیمانی پریس، بنارس	۱۹۱۴ء
۱۲۔ ادیب (اویس احمد)	اردو کا پہلا ناول نگار مولوی نذیر احمد دہلوی	الاسرار کریمی	۱۹۳۴ء
۱۳۔ اردو اکادمی	اردو ادب کو خواتین کی دین	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۴ء
۱۴۔ اسحاق حسین	ہر دل عزیز	افضل المطابع، دہلی	۱۸۹۹ء
۱۵۔ اشرف صبوحی دہلوی	بن باسی دیوی	کتب خانہ علم و ادب	۱۹۴۵ء
۱۶۔ اکبری حیدری	رقاصہ	شاہ جہانی پریس، دہلی	۱۹۲۵ء
۱۷۔ اکبری بیگم	گودڑ کا لال	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	درج نہیں ہے
۱۸۔ امجد حسین خاں	انتقام	سیوک اسٹیم پریس، لاہور	۱۹۱۲ء
۱۹۔ امینہ خاتون	شوکت آرا بیگم (حصہ سوم)	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء

۲۰۔ انور پاشا	ہندوپاک میں اردو ناول (تقابلی مطالعہ)	پیش رو پبلی کیشنز، منر کا، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۲۱۔ ایم اسلم	اشک ندامت	دار البلاغ، لاہور	۱۹۴۶ء
۲۲۔ بدر النسا شہاب (ڈاکٹر)	نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی اقدار	دار الادب، بہار ستان، پٹنہ	۱۹۸۵ء
۲۳۔ بشیر الدین احمد دہلوی	اقبال دلہن	شمسی حیدر آباد	۱۹۱۵ء
۲۴۔ " "	حسن معاشرت	مفید عام، آگرہ	۱۹۱۴ء
۲۵۔ " "	اصلاح معیشت	ولی پرنٹنگ پریس، دلی	۱۹۲۱ء
۲۶۔ بشیر لکھنوی	صالحہ	درج نہیں ہے	۱۹۱۱ء
۲۷۔ بیگم مرزا احمد علی	ماہ درخشاں	حالی پبلی کیشنز ہاؤس	۱۹۳۸ء
۲۸۔ بھگوتی دیال	کٹورہ بھر خون	کشن چند کمپنی واخبار ہمدرد، لاہور	۱۹۱۰ء
۲۹۔ پریم چند	بازارِ حسن	حالی پبلشنگ ہاؤس	۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء
۳۰۔ " "	بیوہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۹۴۱ء
۳۱۔ " "	پردۂ مجاز	لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی	۱۹۴۱ء
۳۲۔ " "	جلوۂ ایثار	اتحاد پریس، لاہور	درج نہیں ہے
۳۳۔ " "	چوگانِ ہستی (حصہ اوّل ودوم)	دار الاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۲۷ء
۳۴۔ " "	غبن (حصہ اوّل ودوم)	لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور	درج نہیں ہے
۳۵۔ " "	فردوسِ خیال	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۹ء
۳۶۔ " "	گئودان	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	۱۹۶۱ء
۳۷۔ " "	گوشۂ عافیت (حصہ اوّل ودوم)	ڈائمنڈ پاکٹ بکس، دہلی	درج نہیں ہے
۳۸۔ " "	میدانِ عمل	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	نومبر، ۱۹۸۲ء
۳۹۔ " "	نرملا	آزاد بک ڈپو	درج نہیں ہے

۴۰۔ تاراچند، ڈاکٹر (مرتبہ)	نذرِ ذاکر	مجلس نذرِ ذاکر، نئی دہلی	۱۹۶۸ء
۴۱۔ تسنیم مینائی	لال چندری	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۴۶ء
۴۲۔ توحید خاں (ڈاکٹر)	مرزا رسوا کے ناولوں میں نسوانی کردار	تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی	۱۹۹۵ء
۴۳۔ ثریا حسین	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
۴۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (حصہ اوّل و دوم)	" "	۱۹۸۴ء
۴۵۔ حالی، الطاف حسین	مجالس النساء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	مارچ ۱۹۷۱ء
۴۶۔ حامد حسین	ماتا	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۸۸ء
۴۷۔ " "	فسانۂ جمیل	" "	۱۹۸۸ء
۴۸۔ حجاب امتیاز علی	اندھیرا خواب	درج نہیں ہے	۱۹۵۰ء
۴۹۔ " "	ظالم محبت	دارالاشاعت، پنجاب	۱۹۴۰ء
۵۰۔ حسین، اے زیڈ	حیاتِ خورشید بیگم	درج نہیں ہے	۱۹۱۷ء
۵۱۔ حسینی، علی عباس	ناول اور ناول نگار	کاروانِ ادب، ملتان صدر	۱۹۹۰ء
۵۲۔ " "	ناول کی تاریخ اور تنقید	انڈین بک ڈپو، لکھنؤ	درج نہیں ہے
۵۳۔ حمیدہ سلطان احمد	ثروت آرا بیگم	نظامی پریس، بدایوں	مئی ۱۹۴۲ء
۵۴۔ خاتون	شوکت آرا بیگم	درج نہیں ہے	۱۹۱۷ء
۵۵۔ خاتون اکرم	پیکرِ وفا	عصمت، دہلی	۱۹۳۰ء
۵۶۔ خاتون، اے آر	افشاں	درج نہی ہے	
۵۷۔ " "	تصویر	انشاء پریس، دہلی	۱۹۳۴ء
۵۸۔ " "	شمع	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۱ء
۵۹۔ خورشید زہرہ عابدی	ترقی پسند افسانہ میں عورت کا تصور	بی بی جی ویمن ہاسٹل دہلی یونیورسٹی	۱۹۸۷ء
۶۰۔ راشد الخیری	امین کا دم واپسیں	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۲۹ء
۶۱۔ " "	انگوٹھی کا راز	درویش پریس	۱۹۱۹ء

نمبر / مصنف	کتاب	مطبع / ناشر	سنہ
۶۲۔ راشدالخیری	بنت الوقت	برقی پریس، دہلی	اکتوبر ۱۹۲۹ء
۶۳۔ " "	تائید غیبی	ممتاز منی ایجنسی، دہلی	۱۹۲۳ء
۶۴۔ " "	جوہر عصمت	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۲۰ء
۶۵۔ " "	جمال ہم نشیں	درویش پریس	۱۹۲۵ء
۶۶۔ " "	چہار عالم	عصمت بک ایجنسی، دہلی	۱۹۳۹ء
۶۷۔ " "	حیاتِ مشترکہ	اسٹیم پریس، لاہور	۱۹۱۷ء
۶۸۔ " "	دلی کی آ[illegible]ی بہار	عصمت بک ایجنسی، دہلی	۱۹۳۷ء
۶۹۔ " "	روداد قفس	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۶۷ء
۷۰۔ " "	سوکن کا جلاپا	یونین اسٹیم، لاہور	۱۹۱۸ء
۷۱۔ " "	سنتوشی	مکتبۂ عصمت	درج نہیں ہے
۷۲۔ " "	نجوگ	دارالاشاعت، پنجاب لاہور	۱۹۲۹ء
۷۳۔ " "	شام زندگی	سلیمانی پریس، بنارس	۱۹۱۲ء
۷۴۔ " "	شب زندگی	عصمت بک ایجنسی	فروری ۱۹۳۳ء
۷۵۔ " "	صبح زندگی	سلیمانی پریس، بنارس	۱۹۱۲ء
۷۶۔ " "	فسانۂ سعید	حمیدہ پریس، دہلی	درج نہیں ہے
۷۷۔ " "	قلب حزیں	محبوب المطابع	۱۹۲۸ء
۷۸۔ " "	قطراتِ اشک	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۲۵ء
۷۹۔ " "	گوہر مقصود	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۲۸ء
۸۰۔ " "	منازل السائرہ (حصہ اول ودوم)	درویش پریس، دہلی	۱۹۲۵ء
۸۱۔ " "	منازلِ ترقی	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۲۶ء
۸۲۔ " "	نوحۂ زندگی	" "	۱۹۱۹ء
۸۳۔ " "	یاسمین شام	عصمت بک ڈپو	۱۹۳۵ء
۸۴۔ رسوا ہادی حسن (مرزا)	اختری بیگم	شادی پریس، لکھنؤ	
۸۵۔ " "	امراؤجان ادا	بھارگو اسکول بک ڈپو	۱۹۴۸ء

۸۶۔ رسوا ہادی حسن (مرزا)	خونی	ایم کے عمان مشہور کرافت، کراچی	درج نہیں ہے
۸۷۔ " "	شریف زادہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	جولائی ۱۹۷۰ء
۸۸۔ رشید احمد ارشد (منشی)	طوافِ زمین	مرزا پبلشنگ کمپنی، لکھنؤ	۱۹۱۹ء
۸۹۔ رشیدۃ النساء	اصلاح النساء	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور	
۹۰۔ رفیعہ سلطان، ڈاکٹر	اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ	مجلس تحقیقات، اردو حیدر آباد	درج نہیں ہے
۹۱۔ رفیق احمد	چھپا	درج نہیں ہے	۱۹۲۰ء
۹۲۔ زبیدہ خاتون وم۔ع۔ سلام	اے آر خاتون بحیثیت ناول نگار، "ادیبہ"	آئینہ ادب، چوک مینار انار کلی، لاہور	۱۹۶۷ء
۹۳۔ زینت شیر، ڈاکٹر	نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار	الیاس ٹریڈرس، حیدر آباد	۱۹۹۱ء
۹۴۔ سجاد حسین (منشی)	پیاری دنیا	شام اودھ، لکھنؤ	۱۹۰۶ء
۹۵۔ " "	طرحدار لونڈی	مجلس ترقی ادب، لاہور	جون ۱۹۶۵ء
۹۶۔ " "	کایا پلٹ	سیٹھ کندن لال پریس، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
۹۷۔ " "	نشتر	ادبی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
۹۸۔ سجاد ظہیر	لندن کی ایک رات	شیو شنکر بھارگوا	۱۹۳۸ء
۹۹۔ سرفراز حسین عزمی (قاری)	سزائے عیش	تمدن بک ایجنسی، دہلی	۱۹۲۳ء
۱۰۰۔ " "	انجامِ عیش	" "	درج نہیں ہے
۱۰۱۔ " "	دلی کا عجائب خانہ	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۲۴ء
۱۰۲۔ " "	سعید	تمدن بک ایجنسی، دہلی	۱۹۳۷ء
۱۰۳۔ " "	شاہد رعنا	اردو اکادمی، کراچی	۱۹۶۰ء
۱۰۴۔ " "	فطرت اشک	ہاشمی میرٹ	۱۹۰۱ء
۱۰۵۔ سرشار، رتن ناتھ	سیر کہسار	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۹۳۴ء
۱۰۶۔ " "	طوفان بے تمیزی	شام اودھ، لکھنؤ	درج نہیں ہے

۱۰۷۔ سرشار، رتن ناتھ	فسانہ آزاد (چار جلدیں)	ترقی اردو بازار	۱۹۸۶ء
۱۰۸۔ " "	کامنی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	درج نہیں ہے
۱۰۹۔ سلطان جہاں بیگم	حیات شاہجہانی	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۹۱۴ء
۱۱۰۔ سہیل بخاری	اردو ناول نگار	الحمرا پبلشرز، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی	جولائی ۱۹۷۲ء
۱۱۱۔ سید احمد دہلوی	قصہ مہر افروز	مخزن پریس، دہلی	۱۹۱۱ء
۱۱۲۔ سید اقبال (مرتبہ)	سفرنامہ پنجاب	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس	۱۹۸۴ء
۱۱۳۔ سید سجاد علی سجاد	محل خانہ	مفید عام پریس، آگرہ	۱۹۰۲ء
۱۱۴۔ " "	نئی نویلی	سیٹھ کندن لال پریس، لکھنؤ	درج نہیں ہے
۱۱۵۔ سید ذکی مرتضیٰ	دیوانہ عاشق	ناول پبلشنگ ہاؤس، آگرہ	۱۹۲۱ء
۱۱۶۔ سیما فاروقی	پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل کی عکاسی	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۹۵ء
۱۱۷۔ سیمیں ثمر فضل، ڈاکٹر	ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ	اے ون فوٹو اسٹیٹ، دہلی	۱۹۹۱ء
۱۱۸۔ ش اختر	عدسہ	کلچرل اکادمی، گیا	ستمبر ۱۹۶۸ء
۱۱۹۔ شاد عظیم آبادی	افیون	نسیم بک ڈپو	درج نہیں ہے
۱۲۰۔ " "	بدھاوا	" "	۱۹۴۴ء
۱۲۱۔ " "	پیر علی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۹۳ء
۱۲۲۔ " "	صورت الخیال	صبح صادق، عظیم آباد	۱۸۸۰ء
۱۲۳۔ شاہد احمد دہلوی	پھانسی	خاتون کتاب گھر، دہلی	۱۹۴۴ء
۱۲۴۔ شرر، عبدالحلیم	بدرالنساء کی مصیبت	الناظر پریس، لکھنؤ	۱۹۱۲ء
۱۲۵۔ " "	جویائے حق	شیخ محمد غلام حسین تاجران کتب لاہور	درج نہیں
۱۲۶۔ " "	حسن انجلینا	معصوم المطابع، لکھنؤ	۱۹۲۵ء

۱۲۷۔ شرر، عبدالحلیم	حسن بن صباح	صادق پریس، لکھنؤ	۱۹۳۱ء
۱۲۸۔ " "	خوفناک محبت	دلگداز پریس، لکھنؤ	۱۹۲۶ء
۱۲۹۔ " "	دلچسپ (حصہ اول ودوم)	ادبی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
۱۳۰۔ " "	دلکش	بلالی پریس، انبالہ	۱۸۹۶ء
۱۳۱۔ " "	شہید وفا	اعجاز مسیحائی، لکھنؤ	۱۹۲۳ء
۱۳۲۔ " "	فیب داں	دلگداز پریس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
۱۳۳۔ " "	غیب کی دلہن	" "	۱۹۰۷ء
۱۳۴۔ " "	مینابازار	یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ	
۱۳۵۔ شریف احمد، ڈاکٹر	عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن	گوہر پبلی کیشنز، دہلی	مارچ ۱۹۸۹ء
۱۳۶۔ شمیم نکہت	پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	جنوری ۱۹۷۵ء
۱۳۷۔ شہید مرتضٰی مطہری (استاد)	عورت پردے کی آغوش میں	دار الثقافہ الاسلامیہ، پاکستان	جولائی ۱۹۸۷ء
۱۳۸۔ صادقہ ذکی، ڈاکٹر	ادب خواتین اور سماج	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	جون ۱۹۹۶ء
۱۳۹۔ صالحہ عابد حسین	عذرا	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	اگست ۱۹۸۷ء
۱۴۰۔ صغرا مہدی، پروفیسر	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	دسمبر ۱۹۸۱ء
۱۴۱۔ " "	ہندوستان میں عورت کی حیثیت (ترجمہ)	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
۱۴۲۔ صغرا ہمایوں	سرگزشت ہاجرہ	درج نہیں ہے	۱۹۲۹ء
۱۴۳۔ " "	زہر ایامشیر نسواں	"	۱۹۰۶ء
۱۴۴۔ صفیر بلگرامی	جوہر مقالات	مطبوعہ نورالانوار، آرہ	درج نہیں ہے
۱۴۵۔ ضیابانو	فریب زندگی	محبوب المطابع، دہلی	اپریل ۱۹۲۴ء
۱۴۶۔ طاہرہ بیگم	افسانۂ نادر جہاں	رام کمار بک ڈپو	۱۹۱۷ء
۱۴۷۔ ط۔ حسن بیگم	روشن بیگم	درج نہیں ہے	۱۹۲۰ء
۱۴۸۔ ظفر الحسن، مرزا	محبت کی چھاؤں	درج نہیں ہے	۱۹۳۰ء

۱۴۹۔ عابدہ سمیع الدین، ڈاکٹر	ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین کا حصہ	ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ	۱۹۹۰ء
۱۵۰۔ عباس بیگ	حکیم گلباز	سلطان پور پریس	۱۹۲۴ء
۱۵۱۔ عباسی بیگم	زہرا بیگم	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۳۴ء
۱۵۲۔ عبدالحفیظ (منشی)	خورشید بہو	درج نہیں ہے	۱۹۰۹ء
۱۵۳۔ عبدالحکیم بیگ (مرزا)	وفائے دلبر	ابوالعلائی پریس، آگرہ	۱۹۱۲ء
۱۵۴۔ عبدالخالق برق (شیخ)	چراغِ سحری	ابوالعلائی پریس، لکھنؤ	۱۹۰۶ء
۱۵۵۔ عبدالسلام (پروفیسر) عبدالحق حسرت (ڈاکٹر)	عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۱۵۶۔ عبدالغفار (قاضی)	لیلیٰ کے خطوط	دارالادب پنجاب، لاہور	دسمبر ۱۹۳۲ء
۱۵۷۔ عبدالغفار (قاضی)	مجنوں کی ڈائری	آزاد بک ڈپو	درج نہیں ہے
۱۵۸۔ عزیز احمد	ہوس	مکتبہ جدید، لاہور	درج نہیں ہے
۱۵۹۔ عصمت شاہد لطیف	ٹیڑھی لکیر	نیا ادارہ، لاہور	مئی ۱۹۴۴ء
۱۶۰۔ عصمت شاہد لطیف	ضدی	اردو مرکز، لاہور	کیم جنوری ۱۹۵۲ء
۱۶۱۔ عظمت علی حسرت لکھنوی	ابن مسعود	قریشی بک ڈپو، دہلی	۱۹۲۸ء
۱۶۲۔ عظیم بیگ چغتائی	مسز کرھلے	ساقی بک ڈپو، دہلی	جنوری ۱۹۳۸ء
۱۶۳۔ عظیم بیگ چغتائی	چمکی	ساقی بک ڈپو، دہلی	درج نہیں ہے
۱۶۴۔ عظیم بیگ چغتائی	شریر بیوی	کلاسیکی پبلشر، دہلی	درج نہیں ہے
۱۶۵۔ عقیل احمد	اردو ناول اور تقسیم ہند	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۷ء
۱۶۶۔ فاطمہ بی بی	مراۃ النساء	نظامی پریس، کانپور	۱۹۰۲ء
۱۶۷۔ فدا علی (مرزا)	لاڈو بیگم	ہندوستانی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
۱۶۸۔ فہمیدہ کبیر	اردو ناول میں عورت کا تصور (نذیر احمد سے پریم چند تک)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	جولائی ۱۹۹۲ء
۱۶۹۔ فیاض علی	انور	اردو اکادمی لکھنؤ	درج نہیں ہے
۱۷۰۔ فیاض علی	شمیم	اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۹۵ء

۱۷۱۔ قمر رئیس	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	سرسید بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۱۷۲۔ کریم الدین (مولوی)	اردو کا پہلا ناول۔ خط تقدیر	دانش محل، لکھنؤ	مارچ ۱۹۶۵ء
۱۷۳۔ کشن پرشاد کول	شاما	دی انڈین پریس لمیٹڈ، الٰہ آباد	درج نہیں ہے
۱۷۴۔ کشور ناہید	عورت مرد کا رشتہ	ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۱۷۵۔ گوری شنکر لال اختر	اتھاہ ساگر	جارج اسٹیم پریس، لاہور	۱۹۱۸ء
۱۷۶۔ گوری شنکر لال اختر	پروگن	کاشی رام پریس، لاہور	۱۹۱۸ء
۱۷۷۔ گوری شنکر لال اختر	بملا	جارج اسٹیم پریس، لاہور	۱۹۱۸ء
۱۷۸۔ مالک رام	اسلامی عورت	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	مئی ۱۹۷۷ء
۱۷۹۔ محمد جمیل الدین (منشی)	آرسی مصحف	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۸۸ء
۱۸۰۔ محمد رحیم دہلوی	زارینہ	ادیب بک ڈپو، دہلی	۱۹۴۴ء
۱۸۱۔ محمد سعید	یاسمین	درج نہیں ہے	درج نہیں ہے
۱۸۲۔ محمد سعید	خواب ہستی	درج نہیں ہے	۱۹۰۵ء
۱۸۳۔ محمد عزیز الدین (قاضی)	کنیز فاطمہ	اسٹیم پریس، آگرہ	۱۹۲۰ء
۱۸۴۔ محمد علی طبیب (حکیم)	اختر و حسینہ	رفیق عالم پریس، ہردوئی	درج نہیں ہے
۱۸۵۔ محمدی بیگم	صفیہ بیگم	رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور	۱۹۱۳ء
۱۸۶۔ مل، جان اسٹورٹ	محکومیت نسواں معین الدین انصاری (ترجمہ)	مکتبہ پنجاب، لاہور	۱۹۳۹ء
۱۸۷۔ نذر سجاد حیدر	اختر الزماں بیگم	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۲۵ء
۱۸۸۔ نذر سجاد حیدر	آہ مظلوماں	گلزار محمدی، لاہور	۱۹۱۸ء
۱۸۹۔ نذر سجاد حیدر	ثریا	درج نہیں ہے	درج نہیں ہے
۱۹۰۔ نذر سجاد حیدر	حرماں نصیب	درج نہیں ہے	۱۹۲۹ء
۱۹۱۔ نذر سجاد حیدر	نجمہ	عصمت بک ڈپو	۱۹۴۵ء
۱۹۲۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	ابن الوقت	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	۱۹۸۰ء
۱۹۳۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	ایامیٰ	پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۸۰ء
۱۹۴۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	بنات النعش	کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ	۱۹۲۰ء

۱۹۵۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	توبۃ النصوح	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	فروری ۱۹۲۷ء
۱۹۶۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	فسانۂ مبتلا	الاشاعت مسلم منزل، دہلی	اگست ۱۹۸۵ء
۱۹۷۔ نذیر احمد (ڈپٹی)	مراۃ العروس	مطبع رزاقی چوک، لکھنؤ	درج نہیں ہے
۱۹۸۔ نیلم فرزانہ	اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۲ء
۱۹۹۔ وحید کوثر، ڈاکٹر	اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات منتخب ناولوں کے پس منظر میں	اعجاز پریس، حیدر آباد	۱۹۸۷ء
۲۰۰۔ وقار عظیم (پروفیسر)	داستان سے افسانے تک	طاہر بک ایجنسی، دہلی	جون ۱۹۷۲ء
۲۰۱۔ وقار عظیم	علامہ راشد الخیری (مرتبہ)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	۱۹۴۵ء
۲۰۲۔ وی پی سوری، ڈاکٹر	اردو فکشن میں طوائف	ادارۂ فکر جدید، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۲۰۳۔ ہادی حسن ہادی	حجاب النساء	مطبع سلیمانی بنارس	درج نہیں ہے
۲۰۴۔ ہادی حسن ہادی	حسن انتقام	درج نہیں ہے	۱۹۱۳ء
۲۰۵۔ ہادی حسن ہادی	حمیدہ بانو	سلیمانی پریس بنارس	درج نہیں ہے
۲۰۶۔ ہادی حسن ہادی	لاڈلی بیٹی	سلیمانی پریس بنارس	۱۹۱۳ء
۲۰۷۔ ہارون ایوب، ڈاکٹر	اردو ناول پریم چند کے بعد	اردو پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۲۰۸۔ یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول	نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد	دسمبر ۱۹۷۳ء

رسائل

۱۔ آج کل، خواتین نمبر، پبلی کیشن ڈویژن، نئی دہلی اگست، ستمبر ۱۹۷۵ء

۲۔ " " جنوری ۱۹۹۲ء

۳۔ تہذیب النسواں، دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۳۳ء

۴۔ " " ۱۹۳۴ء

۵۔ زبان وادب اپریل، مئی، جون ۱۹۸۳ء

۶۔ ساقی، خاص نمبر، جولائی ۱۹۳۸ء

۷۔ سہیلی، لاہور، جنوری ۱۹۳۴ء

۸۔ عصری ادب، خواتین خصوصی نمبر، اپریل تا اکتوبر ۱۹۸۰ء

۹۔ عصمت، کراچی، ۱۹۰۸ء

۱۰۔ عصمت، دہلی، جنوری ۱۹۳۲ء

۱۱۔ عصمت، دہلی، جولائی ۱۹۴۰ء

۱۲۔ نیا دور، اکتوبر ۱۹۷۳ء

۱۳۔ یوجنا، نومبر ۱۹۸۸ء

English Books

Auther	Title	Publisher	year of Publication
Anees Jung	Night of the New Moon	Penguin Books Delhi	
Carol C. Gould and Max W. Wartofsky	Women and Philosoghy	G. P. Putnam's sons Madison Avenue	1980
Fatima Mernissi	Women and Islam	Kali for Women	1983
Firoze Mookerji	Lucknew and the World of sarshar	Saad Publications. Pakistan	1992
Gayle Green & Coppelia Hahn No. 6 & 7	Changing subjects (The Making of Feminist literary Criticism	Routledge . London	1953
Kalpana Ram	Mukkuvar Women	Kali for Women New Delhi	1992
Kamla Bhasin & Nikhat Said Khan	Some Questions on Feminism and its relevance in South Asia	Kali for Women	9186
K. K. Sharma	The Tradition in modern Novel-Theory	Abhinav Publications New Delhi	1991
Leela Mullati	The Bhakti Movement and the status of Women	Abhinav Publication New Delhi	1989
Majumdar D. N. & Madan T. N.	An Introduction to Social Anthropology	Asia Publishing House. Calcutta	Feb. 1992
Mohini Anjum (Edited)	MuslimWomen in India	Radiant Pulications	1992
Nadine strossen	Defending Pornography Free Speech. Sex and the fight for Women's Right	Printed and bound in Great Britain by clays Ltd. St. Lvesple	1995

Neera Kukreja Sohini	Status of Girls in Development Strategies	Har-Anand publication. New Delhi.	1994
Pratima Choudhry (Dr.)	Women's Education in India (Myth and Reality)	Har-Anand Publication. New Delhi	1995
Reinhild Boem & Zohra Hasaini (Edited)	A Voice for visible Menority Women	Canadian Women's Association	1994
Rosalind Miles	The Women's History of the World	Harper Collins Publisher. London	1993
Sara Mills (Edited)	Gendering the Reader	Harvester Wheal-sheaf Herfordshire	1994
Shahida Lateef	Muslim Women in India	Kali for Women	1990
Shaista Akhtar Bano	A critical survey of the devolpment of the Urdu Novel and short Story	Longmans. Green S. Co. London. U.K.	1945
Sunada P. Chavan	The Fair Voice a Study of Indian Women Poets in English	Sterling Publisher Pvt. Ltd. N.D.	1984
Susan Alice Walkins. Marisa Rueda and Marta Rodriguez	Feminism for Beginners	BPCC Hazells Ltd. U.K.	1992
Syed Abdul Latif (Compiled and Edited)	An Outline of the Cultural History of India	The Institute of Indo-Middle East Cultural Studies. Hyderabad	Jan. 1958
Tanika Sarkar & Urvashi Butalia	Women and the Hindu Right (The Collection of Essays)	Kali for Women	1995
Venkatachalam R. Viji Srinivasan	Famale Infanicide	Har-Anand Publication. New Delhi	1993

Author	Title	Publisher
Viginia Woolf	A Room of Ones's Own	Granada London
" "	Women & Writing Indtroduced by Michele Barrett	The Women Press Ltd.
Wendy Doniger with Brain K. Smith (Translated)	The laws of Manu	Penguin Books
	Report on Develop-ment of Female Ed-ucation Among Tribal Commu-nities	National Commi-sion for Women N.D.
	Status of Women Through Curricu-lum	N.C.E.R.T.
	The National Com-mission for Women Act. 1990 Govt. of India	National Commis-sion for Women. N.D.
	Women and Panchayati Raj Institutions Pro-ceeding of the National workship 18-19 Oct. 1993	The National Com-mision for Women. N.D.